بیان میرٹھی
اور
غالب
ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

کتاب کا نام : بیان میرٹھی اور غالب
مصنف کا نام : ڈاکٹر شرف الدین ساحل
حیدری مسجد روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸/
ناشر : علیم پرنٹرس
حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور
مطبع : سلمان فائن آرٹس، مومن پورہ، ناگپور
کاتب : عجاز احمد انصاری، (روشن کالونی ناگپور ۹/)
سالِ اشاعت : ۱۹۹۷ء

BAYAN MEERATHI AUR GHALIB
By : Dr. M. Sharfuddin Sahil

ملنے کا پتہ
رحیم اسٹورس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸/

قیمت : ۵۰ روپے

ماہرِ غالبیات

جناب مالک رام

اور

جناب نظر انصاری

کی نذر

جنہوں نے میرے ذوقِ تحقیق کو تقویت پہنچائی

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ

شناس نامہ

نام مع تخلص : محمد شرف الدین ساحلؔ

پتہ : حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

والد کا نام : حاجی محمد یٰسین (وفات: ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء)

مقام پیدائش : مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)

تاریخ پیدائش : ۲ اگست ۱۹۴۹ء

تعلیم :	ایم اے (اردو)	۱۹۷۴ء	ناگپور یونیورسٹی
	ایم اے (فارسی)	۱۹۷۶ء	ناگپور یونیورسٹی
	ایم اے (عربی)	۱۹۷۸ء	ناگپور یونیورسٹی
	بی ایڈ	۱۹۸۱ء	ناگپور یونیورسٹی
	پی ایچ ڈی	۱۹۷۷ء	ناگپور یونیورسٹی
	پی ایچ ڈی	۱۹۸۶ء	ناگپور یونیورسٹی

تصانیف :	ملت اسلامیہ کا سفر	۱۹۸۰ء	تحقیق
	بیان میرٹھی حیات و شاعری	۱۹۸۰ء	تحقیق و تنقید
	کامٹی کی ادبی تاریخ	۱۹۸۲ء	تحقیق و تنقید
	دستِ کوہکن	۱۹۸۳ء	شعری مجموعہ
	تاریخ ناگپور	۱۹۸۳ء	تحقیق
	شرارِ جستہ	۱۹۸۵ء	شعری مجموعہ
	شرح قصیدہ مدیح خیر المرسلین	۱۹۸۹ء	شرح و تنقید

رعنائی خیال	۱۹۸۹ء	شرح وتنقید
واردات ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	تحقیق وتنقید
حرا کی روشنی	۱۹۹۰ء	نعتیہ شعری مجموعہ
سید اوران کے مضامین ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	تحقیق وتنقید
شرح کلام غالب (ردیف واؤ)	۱۹۹۰ء	شرح
شرح اشعار مومن	۱۹۹۲ء	شرح
ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر	۱۹۹۳ء	تحقیق وتنقید
معیار ادب	۱۹۹۴ء	تنقیدی مضامین کا مجموعہ
ناگپور کا مسلم معاشرہ (جلد اوّل)	۱۹۹۶ء	تحقیق
قطرہ قطرہ	۱۹۹۶ء	تنقید وصحافت
آئینہ سیما	۱۹۹۶ء	شعری مجموعہ
ناگپور کا مسلم معاشرہ (جلد دوم)	۱۹۹۷ء	تحقیق
بیان میرٹھی اور غالب	۱۹۹۷ء	تحقیق

انعامات : بیان میرٹھی حیات وشاعری پر ۱۹۸۱ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ اور مہاراشٹر اردو اکادمی بمبئی سے انعام ملا۔

کامٹی کی ادبی تاریخ پر ۱۹۸۳ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی بمبئی سے انعام ملا۔

تاریخ ناگپور پر ۱۹۸۴ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی بمبئی سے انعام ملا۔

ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر پر ۱۹۹۴ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ سے انعام ملا۔

فہرست

غالبؔ

بیانؔ میرٹھی

حرفے چند

بڑی شاعری کی ایک خصوصیت یہ کہی جاتی ہے کہ وہ دیرپا ہوتی ہے اور آنے والے ادوار کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اردو شاعری میں شاید اس تعریف کا اطلاق سوائے غالب کی شاعری کے کسی اور شاعر کے کلام پر نہیں ہوتا۔ زمانہ حال کے مشاہیر شعرا کی فہرست پر نظر ڈال لیجئے۔ اساتذہ کو چھوڑ دیجئے۔ کیوں کہ کہنے کو ان کا نام صرف شاعری کے ساتھ جڑا ہوا ہے، حقیقت میں ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ یہاں ان چند شاعروں کا نام لیتا ہوں جن کی شہرت کو میں نے اپنی آنکھوں سے بام پر دیکھا ہے۔ پہلے شاعر اختر شیرانی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ شعر کے شائقین ان سے عشق کرتے تھے لیکن اب کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ میراجی شعر و ادب کی صفوں کو درہم برہم کر دینے والی ہستیوں میں تھے، لیکن اب تقریباً معدوم ہو چکے ہیں۔ شکیل بدایونی، سلام مچھلی شہری، حفیظ جالندھری تک نقش ذنگار طاقِ نسیاں ہوئے جا رہے ہیں۔ کیوں کہ ایسے سب شاعر ایک دور کے شاعر تھے، نئے ادوار، نئے تقاضوں کو مطمئن کرنے کی سکت ان میں نہ تھی۔ مگر غالب لگ بھگ ڈیڑھ صدی گزر جانے پر بھی زندہ ہے۔ زندہ ہی نہیں بلکہ سب پر غالب آچکا ہے۔

ظاہر ہے ایسے حالات میں غالب کو اردو شاعری کی آبرو مان لینے کے سوائے

چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ان کے کلام اور ان کی زندگی کے ہر جز پر کلی نظر ڈالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس دلچسپی نے رفتہ رفتہ "غالبیات" کو جنم دیا اور نتیجے کے طور پر غالب پر کم اور غالبیات پر کتابوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اتنی کتابیں لکھی گئیں کہ اگر انھیں یکجا کر لیا جائے تو وہ اپنی ذات میں ایک کتب خانہ کہلانے کی حقدار ہو جائیں۔ میں تو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا مگر اکثر ایسا کہا جاتا ہے کہ میرے کتب خانے کا غالب کلکشن دنیا میں سب سے بڑا ذخیرۂ غالبیات ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہو، ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ تاہم میرے یہاں جو غالب اور غالبیات پر کتابیں اور رسالے ہیں اور جنہیں کیٹلاگ کیا جا چکا ہے ان کا آخری نمبر ۱۸۶۹ ہے ؏۔ اتنی ساری کتابوں کی اشاعت کے علاوہ، رسائل کے سینکڑوں شماروں میں شائع ہونے والے مضامین کے بعد اس چیخ پکار کو کہ اب غالب اور غالبیات کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہ گیا جس پر کوئی اضافہ کیا جا سکے، مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں کہ نئی کتابوں کا حال عموماً یہ ہے کہ شراب تو وہی ہوتی ہے، صرف بوتلیں نئی ہوتی ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی کبھار، غالب کے کم، غالبیات کے نئے گوشے سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک گوشے کو محیط یہ کتاب "بیان میرٹھی اور غالب" ہے۔ جسے ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے مرتب کیا ہے۔

غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو بیان (ولادت ۱۸۵۰ء) کم و بیش ۱۹ سال کے تھے۔ جھانسی میں اپنے نانا کے مکان پر پیدا ہوئے، بچپن جھانسی اور کالپی میں گزرا، تقریباً دس سال کی عمر میں نانا کے انتقال کے بعد، میرٹھ آئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اس لئے یہ امکان بہت کم ہے کہ بیان نے کبھی غالب

؏ یہ نمبر غالب کا سالِ وفات بھی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے (رضا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء)

کو دیکھا ہو یا ان سے ملے ہوں ۔ البتہ یہ درست ہے کہ میرٹھ اور دہلی میں صرف ۶۶ کلو میٹر کا فاصلہ ہے اور میرٹھ میں کئی شاگردوں کے علاوہ غالب کے سینکڑوں مداح بھی موجود تھے۔ جن کی وجہ سے میرٹھ میں غالب کے نام اور کلام کا خاصا چرچا رہتا ہوگا ۔ اس لیے یہ بیان کی اعلیٰ ذہانت ہی کا ثبوت ہے کہ اسے کسی اور سے نہیں ، غالب ایسے جیّد اور فکری شاعر سے نہایت درجے کا لگاؤ پیدا ہوگیا جو عمر بھر رہا ، حتیٰ کہ جب ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ ء کو ان کا انتقال ہوا ہے اس وقت وہ بالاقساط دیوانِ غالب کی شرح لکھنے اور شائع کرنے میں مصروف تھے ۔

محبّی ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے " بیان میرٹھی ۔ حیات و شاعری " ۱۹۸۰ ء میں شائع کی تھی جو اب تک بیان پر حرفِ آخر ہے ۔ " بیان میرٹھی اور غالب " اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ اس سے نہ صرف خود ڈاکٹر صاحب کا قد بحیثیت محقق نمایاں ہوا ہے بلکہ غالبیات کے موضوعات میں بھی ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ غالب اور غالبیات کے شائقین اس کتاب کا پرزور استقبال کریں گے ۔

بمبئی ۴۰۰۰۳۶ — کالی داس گپتا رضا

۳۱ مارچ ۱۹۹۲ ء

بیان میرٹھی

اور

غالب

”مرزائے مرحوم (غالب) اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے۔
ہندوستان میں مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد ایسا نازک
خیال کوئی پیدا نہیں ہوا۔“ —— بیانؔ میرٹھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا ورق

بیان میرٹھی، انیسویں صدی کے ایک زبردست عالم، شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ وہ خلوت پسندی اور اعصابی مرض میں مبتلا رہنے کے باوجود بھی مستقل مزاجی سے تقریباً پینتیس سال تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے ہفتہ وار اور ماہنامے نکالے، شاعری میں سب رنگ اچھالے، ادب کی بدلتی قدروں کا ساتھ دیا، نظم و نثر میں ہزاروں صفحات سیاہ کئے۔ لیکن اپنی تخلیقات کو نہ تو جمع کیا اور نہ ہی قرینے سے چھپوایا۔ ان کے جو چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوتے وہ بھی میرٹھ کی حدود میں قید ہو کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وفات کے چند برسوں بعد بھلا دیے گئے۔

اسی احساس نے مجھ کو بیان کے حالات اور کلام جمع کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے اس کام کی ابتدا ۱۹۷۰ء کے آس پاس کی اور مسلسل دس برس کی تلاش و محنت کے بعد "بیان میرٹھی حیات و شاعری" کے عنوان سے تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ایک کتاب تیار کر کے ۱۹۸۰ء میں شائع کروائی جو ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

زیر نظر تالیف "بیان میرٹھی اور غالب" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ یہ کتاب ماہر غالبیات جناب کالیداس گپتا رضا صاحب کی تحریک سے منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ میں نے اس کتاب میں غالب سے بیان میرٹھی

کے ذہنی رشتے کو ظاہر کیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیان ایک ایسے غالب پرست تھے جنہوں نے نہ صرف غالب کی غزلوں پر غزلیں کہیں بلکہ ان کے رنگ کو اپنانے کی اپنی سی کوشش بھی کی — غالب کے طرز پر خطوط تحریر کیے اور غالب کے دیوان کی پہلی بار تفصیل سے شرح لکھنا شروع کی۔

یہ کتاب سلسلۂ غالبیات میں اضافہ ہو سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ بالغ نظر قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

ناگپور
یکم مارچ ۱۹۹۲ء

ناچیز
محمد شرف الدین ساحل

سید محمد مرتضیٰ بیان دیزدانی میرٹھی (۱۸۵۰ء ۔ ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء) انیسویں صدی کے ایک باکمال شاعر، صحافی اور نثر نگار گزرے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد، سادات کی قدیم بستی جارچہ (ضلع بلند شہر) کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اپنے وطن کو چھوڑ کر میرٹھ آیا اور وہیں مستقل آباد ہو گیا۔ ان کے والد کا نام سید گوہر علی (ف: ۸ مارچ ۱۸۹۳ء) تھا، جو لوگوں میں میر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ دادا کا نام سید کرامت علی تھا۔ بیان نے اپنے والد کے نام کا سجع کہا ہے: ۱ے

"بحر کرامت کا گوہر علی"

بیان مذہباً اثنا عشری شیعی تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام رضا سے ملتا ہے۔ ان کی پیدائش اپنے نانا سید عمر دراز علی کے مکان پر ہوئی تھی، جو اس وقت جھانسی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ بعد کو انھوں نے میرٹھ میں نشو و نما پائی اور زندگی کا بڑا حصہ اسی شہر میں گزارا، اس لیے میرٹھی کہلائے۔

بیان غذائق دنیوی سے بے نیاز تھے۔ انھیں شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ اور کسی چیز سے ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ صحافت سے گہری دلچسپی تھی۔

انھوں نے سب سے پہلے "جلوۂ طور" کی ادارت کی۔ پھر ۱۸۸۱ء میں اپنا ذاتی ہفت روزہ "طوطیِ ہند" نکالا۔ اس کے بعد ۱ جون ۱۸۸۷ء کو ماہنامہ "لسان الملک" جاری کیا، جس کا شمار اس زمانے کے معیاری رسائل میں ہوتا تھا۔ ۲۰ صفحات کا یہ ماہنامہ ۲۶ × ۲۰ / ۸ کے سائز پر بڑے اہتمام سے مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں بیان کی اردو فارسی غزلوں اور دیگر منظومات و منثورات کے علاوہ ان کے بیشتر شاگردوں کا کلام بھی چھپتا تھا۔

بیان صحیح معنوں میں وہبی اور وجدانی شاعر اور نثر نگار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے خلوت پسندی کے باوجود ہر معاصر سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی تحریکوں میں شرکت کی۔ ادبی معرکے لڑے۔ ادب کی بدلتی قدروں کا ساتھ دیا۔ شاعری میں نئے نئے گوشے نکالے اور ہر رنگ اچھالے۔ خمخانۂ جاوید کے مصنف لالہ سری رام ان کے ذکر میں لکھتے ہیں: ؎

"سید محمد مرتضیٰ بیان ویزدانی میرٹھ کے نامور اور قابلِ ذکر شعرا میں تھے۔ استعدادِ علمی بہت معقول اور فنِ سخن میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ مزاج بہت آزاد اور بے باکانہ پایا تھا۔ نظم و نثر پر قادر تھے۔ مبدءِ فیاض سے شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا ——— جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ ایک عجیب کمال ان کی قادرانہ ہمہ گیر طبیعت میں یہ تھا کہ جس رنگ میں چاہتے تھے فکرِ سخن کرتے اور پھر یہ نہیں کہ صرف قافیہ پیمائی ہو بلکہ فی الحقیقت اس رنگ میں اپنی زورِ طبیعت سے وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ

جاتے ۔ مثلاً ان کے بعض اشعار مرزا غالب کے رنگ
میں ایسے لاجواب ہوتے تھے کہ اجنبی کو مرزا غالب کے کلام
کا دھوکا ہو جاتا تھا ۔"

گویا بیان اپنے عہد کے ایسے بے مثل فنکار تھے جو ہر لہجے کو اپنانے اور ہر قدر دل
کا ساتھ دینے کی خاصی صلاحیت رکھتے تھے ۔ ان کی فطرت کی یہ خوبی ان کی
ذکاوت ، ذہانت ، علمیت اور وسیع النظری کا مکمل ثبوت فراہم کرتی
ہے ۔

چوں کہ ہمیں غالب سے بیان میرٹھی کے فکری اور معنوی رشتے کو واضح
کرنا ہے لہٰذا دوسری باتوں سے صرفِ نظر کر کے ہم پورے یقین و اعتماد کے
ساتھ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ بیان اپنے دور میں غالب کے سب
سے بڑے مداح اور پرستار تھے ۔

غالب اردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے روایت سے بغاوت کی ۔ اردو
شاعری کو اپنی جدت پسندی اور اپنے انفرادی رنگ سے ایک نیا موڑ دیا ۔
اپنی " انا " کے بل بوتے پر صاف ستھرے ، معنی خیز اور لطیف اشعار
نکال کر اپنے ہمعصروں کو بہت پیچھے چھوڑا ۔ ان کی شاعری میں وہ قوت
و توانائی ہے کہ ہر دور کی نمائندگی اور ترجمانی کرتی ہے اس لیے حافظ کی
شاعری کی طرح ان کی شاعری بھی قیدِ زماں سے باہر ہو گئی ہے ۔ ان
کے یہاں لطیف تشبیہات و استعارات کثرت سے ملتے ہیں ۔ ان کے
مستعمل الفاظ و تراکیب میں جاذبیت و کشش کے ساتھ جہانِ معنی پنہاں
ہوتا ہے اس لیے ان کا طرزِ شعر گوئی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ لیکن
تاریخ شاہد ہے کہ غالب کی زندگی میں اکثر لوگوں نے ان کی شاعری کو
مہمل اور بکواس بھی قرار دیا ۔

غالب کی وفات کے بعد بھی عرصۂ دراز تک ان کی شاعری مدح و قدح کا شکار رہی۔ ایک گروہ وہ تھا جو غالب کے کلام کی خوبیاں بیان کرتا اور دوسرا اس کے عیوب کو واضح کرتا۔

بیان میرٹھی کا شمار غالب کے مداحین اور پرستاروں میں تھا۔ جب غالب کی وفات (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ہوئی تو بیان جوانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ یہ سارے حالات ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ انھوں نے بھی اپنی فکر رسا کی کسوٹی پر انھیں جانچا اور پرکھا اور نہ صرف غالب کے فکر و فن کا فوری اثر قبول کیا بلکہ ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ ان کی غزل پر تضمین لکھی، قطعۂ ڈلی کے جواب میں قطعہ کہا، سہرا لکھا۔ ان کے لہجے کو اپنانے کی اپنی سی کوشش کی۔ اپنے بعض خطوط میں ان کے طرزِ تحریر کی کامیاب تقلید کی اور ان کے مجموعے "عودِ ہندی" سے متاثر ہو کر اپنے مجموعے کا نام "تیغ ہندی" رکھا۔ مضامین میں ان کے اشعار نقل کیے اور جب کلام غالب کی مشکل پسندی کا چرچا عام ہوا تو ان کے دیوان کی شرح لکھنا شروع کی یہ تمام حقائق ان کی غالب پرستی کی شہادت دیتے ہیں۔

غالب کی زمینوں میں بیان کی غزلیں:

بیان نے غالب کی زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں انھیں دیکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی اس قسم کی غزلوں میں غالب کی سی جدت، ندرت اور انفرادیت ملتی ہے اور وہ الفاظ و تراکیب نظر آتے ہیں جنھیں غالب نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ ہمیں بیان کی جو غزلیں ملی ہیں ان میں سے نمونے کے طور پر چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں۔

ان کا منجملۂ اربابِ دفا ہوجانا
میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہوجانا

رہ گیا تشنۂ دیدار کی تمثال، حباب
تھا مجھے آنکھ کے کھلتے ہی فنا ہوجانا

قلب، ماہیتِ اشیا ہے، بتاثیرِ فشار
درد کو چاہیے، پہلو میں دوا ہوجانا

ہمت قطرۂ شبنم ہے، عرق ریز جبیں
کہ بیک پرتوۂ مہر، فنا ہوجانا

جادۂ راہ ہے شبنم کے لیے تارِ شعاع
چاہیے حسنِ طلب راہ گرا ہوجانا

آب زن قطرۂ شبنم ہے، بداغفلتِ ہوش
پھر تقاضا کہ ذرا جلوہ نما ہوجانا

برق شوخی سے نہفتہ، وہ پری زاد ہوا
یاد آیا ہے مجھے شعلے کا ہوا ہوجانا

نقش بے ربط سمجھ، صورتِ خطِ توام
صفحۂ ہستی عالم کا جدا ہوجانا

سطرِ تعلیم تمنا ہے، ترا بندِ قبا
چاہیے شوق میں ہر عقدے کا وا ہوجانا

تھا جو در پردہ بیاں، زخمہ زنِ تارِ نفس
مجھ کو ہر پردے میں تھا پردہ سرا ہوجانا

۲

نفسِ شہر پہ شہ پہ ہے کیفِ شباب میں

ساقی شراب تھی، کہ ملی تھی شراب میں
غیر از حجاب کچھ نہیں رکھا حجاب میں

کچھ حسنِ شوخ بند نہیں ہے نقاب میں
عقدے اسی قدر دلِ خانہ خراب میں
ہیں جس قدر گرہ ترے بندِ نقاب میں

ہاں ہاں شکستِ توبہ کی آواز میکشو
سنتا ہے کون غلغلِ رعدِ سحاب میں

وہ ہم سے بارِ عام میں دیکھا نہ جائیگا
تکرار کیوں ہے ردیتِ محشر کے باب میں

ریشِ سفیدِ شیخ سے بچنا، کہ عنکبوت
رکھتی ہے دامِ مکر، دہن کے لعاب میں

اے شوخ، آج کون ترا پردہ پوش ہے
لاؤں شبِ فراق کو روزِ حساب میں

دل میں کبھی، بغل میں کبھی، چشم میں کبھی
آوارہ شوخیوں نے کیا ہے حجاب میں

آخر سمندِ عمر نے کھائی سکندری
بے چوبہ سپہرِ کہن کی طناب میں

زاہد کی ریشِ پنجۂ شاہد میں کیوں نہ ہو
رنگِ حنائے گمشدہ بگڑا خضاب میں

تیر افگنِ مژہ کی صفائی تو دیکھنا
دل چھد گیا ہوا نہیں روزن نقاب میں

سمجھا سوادِ سنبل و سرخیِ گل ہمیں

آئی بہار گر ترے خط کے جواب میں

جو جلوہ فیضِ عشق سے مفتِ نظر ہوا

گزرا نہ تھا خیالِ زلیخا کے خواب میں

بازی گرِ فلک کا تماشا، فریب تھا

ٹھہرے ہیں طفلِ طبع جہانِ خراب میں

اپنا غبار کون قیامت میں لے گیا؟

گر شورِ حشر تھا، نہ تمہاری رکاب میں

ہے مصحفِ مجید میں بھی احسن القصص

تحسینِ خوب رو، ہے نصوصِ کتاب میں

اے شورِ زنگِ ناقۂ لیلیٰ صدا تو دے

آوارہ قیس کی ہیں امیدیں سراب میں

گو اس غزل کی داد اسد اللہ خاں نے دی

"جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں"

آج اے بیاں وہ پھول کھلا دے کہ دیدہ ور

لے جائیں دامنِ نظرِ انتخاب میں

— ۳ —

سچ ہے مے وہ شعلہ بن گئے کیفِ شراب میں

کانٹے نے اور آگ لگا دی شباب میں

رہتا نہیں ہے آتشِ خاموش کا فروغ

کچھ منہ سے بولیے بھی تو جوشِ عتاب میں

محشر مرا غبار اٹھائے، مگر اے خدا

رکھ دامنِ جنابِ رسالتمآب میں

کہتی ہے صبح، مہر قیامت کو دیکھ کر
ذرے تھے ایسے رہ گزرِ بوتراب میں

آئینہ لوٹتا ہے، خطِ سبز کی بہار
کیا خضر کو فریب دیا ہے سراب میں

شوقِ سجود، داغِ جبین نیاز تھا
گستاخیاں ہوئیں تیرے در گی جناب میں

پاداشِ ظلم دیکھئے، دل زلف میں رہا
دل میں رہی تمہاری تمنا عذاب میں

اعجاز خاص ہے گہرِ نظم کا رواج
اے دل روانیاں نہیں موتی کی آب میں

بندِ قبا کھلا تو وہ غصّے سے چپ ہوئے
لو اَدرسہؔ باب ہوا فتح باب میں

واعظ نہ توڑ ساغر و مینا خدا سے ڈر
کس کی شبیہہ ہے فلک و آفتاب میں

ردکردہ زمین و فلک، بجلیاں کہاں
آہیں کسی غریب کی ہیں اضطراب میں

شاگرد مرغِ کلک ہے اس بازِ تیغ کا
تھا جس کا آشیانہ کفِ بوتراب میں

گر ہے غرور گرم روی آفتاب کو
اترے ہمارے وادیٔ گم گشتہ آب میں

بھر بھر کے دولتِ کے وجمشید پھینک دی
ساقی گدائے خم نے، کدو ئے شراب میں

کیوں کر عدم میں فتنۂ محشر مچائے شور
ہے عاشقانِ یار کی تقدیر خواب میں

پہلو میں آگ، دل میں سناں، زخم میں نمک
کیا فرق تفتگانِ جنون و کباب میں

بے ہے وہ دل کہ فرشِ تگاپوئے ناز سے
آتی ہے پا برہنہ قیامت رکاب میں

غیر از عطائے دوست نہیں، مایۂ عباد
"حیراں ہوں پھر محاسبہ ہے کس حساب میں"

پشت و شکم، زمین و لحد، وادیِ جزا
مٹی رہی خراب، جہانِ خراب میں

شوقِ شمارِ بوسۂ رخ داد خواہ ہے
یارب شبِ وصال ہے روزِ حساب میں

سوزِ جمالِ یار نے ایجادِ لو کیا
صبحِ ازل سے داغ نہ تھا آفتاب میں

کیوں کعبہ و کنشت میں سر پھوڑتے ہیں لوگ
سجدوں کی منتہا ہے اسی کی جناب میں

ہمسر ہوئی تھی کس کے رخِ تابناک سے
آتش پڑی ہوئی ہے سقر کے عذاب میں

گر ہم فنا ہوئے تو فنا ہے سپہر بھی
شکلِ ہوا مکیں ہے مکانِ حباب میں

دریائے ہفت گانۂ گردوں نہ دھو سکے
کیا داغ حسنِ رشک سے تھا ماہتاب میں

یک مشتِ خاک خَم نے فلاطوں بنا دیا
ساقی ڈبو مجھے بھی سبوئے شراب میں

جورِ نگاہِ یار کی میزاں نہ دی گئی
ایک مد ہوئی تمام نہ روزِ حساب میں

نالے نے اس جہان میں کیا جانے کیا کیا
آیا دھواں کہاں سے جہانِ خراب میں

مدہوش کر دیا ترے غمزے نے کس قدر
آدم گرے کہاں سے جہانِ خراب میں

نطق بیاں نے آج تفاوت عیاں ہوا
گلبانگِ عندلیب و نوائے غراب میں

۴

صبحِ قیامت آگئی، کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں کھولے ہوئے قبا کہ یوں

گوہر نابسود کو، زلف میں مت دکھا کہ یوں
میری کمندِ شوق میں رات کے وقت آکہ یوں

کیوں کر جھکے نسیم سے سوچ تھی نرگسِ چمن
دیکھ کے چشمِ ناز کو آنے لگی حیا کہ یوں

چاہتے تھے شہود میں غیب کا رنگ دیکھنا
میری ز خویش رفتگی بن گئی رہنما کہ یوں

سہو تھی وضعِ خاستن، بسترِ عیش وصل سے
دیکھ کے ان کی شوخیاں فتنہ ہوا بپا کہ یوں

دیدۂ اہلِ عشق ہے، نورِ نگاہ سے تہی

آئے وہ ورزشِ ناز پر چھوڑ کے کفشِ پا کہ یوں
میں نے کہا کنارِ ناز چاہیے اس غمیں سے پُر
سن کے رقیبِ زشت کو پاس بٹھا لیا کہ یوں
شعلۂ رشکِ غیر سے، جل کے اٹھا نہ جائے تھا
دودِ چراغِ بزم نے اٹھ کے بتا دیا کہ یوں
خونِ شہیدِ عشق وہ کہتے تھے فاش کیسے ہو
رنگِ گلِ عذار سے سرخ ہوئی ہوا کہ یوں
اس کفِ پا کے بوسے کی کب مجھے راہ یاد تھی
بدرقۂ طلب ہوئی، جراتِ سنگِ پا کہ یوں
رزق نہیں ہے بن تلاش کہتی تھی تنگیٔ معاش
گردشِ سنگ آسیا دینے لگی صدا کہ یوں
اس کے خرامِ شوق سے پس گئی خلق کس روش
مٹ گئی بادِ تند سے صورتِ نقشِ پا کہ یوں
سعیٔ طریقِ شوق سے فتنے کو آگہی نہیں
اس کی جلو میں دوڑ کے ہے سایہ برہنہ پا کہ یوں
شب کو نموئے رنگ سے خندۂ گل کا ذکر تھا
نشو و نمائے حسن سے ٹکڑے ہوئی قبا کہ یوں
نرگسِ مہوشاں سے پوچھ گردشِ آسماں سے پوچھ
سرمہ ہوئے دفا سرشت کیا کہیں اے خدا کہ یوں
صانعِ گلشنِ ارم میں نے کہا کہ ہٹیئے ہائے
دریہ اس انجمن سے دور قتل مجھے کیا کہ یوں
میں نے کہا نسیم سے چٹکی ہے غنچہ کس طرح

گنجِ دہانِ تنگ سے بوسے نے دی صدا کہ یوں

ریختہ رشکِ فارسی اس سے نہ ہو سکا بیاں

محفلِ عرسِ میر میں شعر مرے سنا کہ یوں

قصیدہ در مدح نواب علی مراد خان بہادر :

دیوانِ غالب کی اس غزل میں بڑی وسعت و تنوع ہے :

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

اس میں غالب آٹھویں شعر سے قصیدے کا پیوند لگا کر پانچ شعر میں نواب تجمل حسین خان ، والیِ فرخ آباد کی ستائش کرتے ہیں اور مقطع میں شعرا کو اس کا تتبع کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔

بیان نے یہ خطابیہ قصیدہ اسی زمین میں لکھا ہے جو ان کی مطبوعہ مثنوی جرمانہ آفتاب (ص : ۲ ، ۳) کے دیباچے میں شامل ہے ۔ یہ نواب علی مراد خان بہادر ، والیِ سندھ (حیدر آباد) کی شان میں قلمبند کیا گیا ہے ۔

سپہر جھک کے سلامی ، ہوئے کہاں کے لیے

علی مراد بہادر سے جم نشاں کے لیے

وہ ہند کا مہِ انور ، وہ سندھ کا والی

زحل ہے ہندوِ دراس کے آستاں کے لیے

وہ ہے رواقِ عماری میں بسکہ جلوہ نشاں

ترس رہے ہیں فلک ، اوج پیلباں کے لیے

ہے پر گہر ، ز بخشش ہے ، کشتیِ فقرا

ہے جائے قطرہ ، دراس بحر بیکراں کے لیے

نہ ہے ہوائے ترحم ، غبارِ راہ ترا
عصا ہوا فلکِ پیر ، ناتواں کے لیے

وہی گروہِ کواکب میں ہے سعادت مند
کہ جس نے بوسے ترے سنگِ آستاں کے لیے

ترے حسود کا ڈھونڈے اگر سراغ کوئی
سنانِ نیزہ اک انگشت ہے نشاں کے لیے

مہبِ فیضِ سحر سے اگر نسیمِ سحر
گئی شگفتنِ گلہائے بوستاں کے لیے

محلِ لطفِ اتم سے ترے نسیمِ تنفس
چلی ہے خندۂ دلہائے دوستاں کے لیے

خمِ تواضعِ گردن ، فرازِ خلق ترا
ہے خاتمِ کفِ جم ، صیدِ انس و جاں کے لیے

ترے نظیر کی ہیبت سے یاں بھی امن نہیں
گیا تھا سوئے عدم فتنہ کیوں اماں کے لیے

ترے ضمیر کی فہرست، تیری لوحِ جبیں
کہ گنج نامہ ضروری ہے گنجداں کے لیے

صفِ نعال میں کی پارہ جا درِ مہتاب
ترے حشم نے قمر سے عوض کتاں کے لیے

بتاؤں کیا ترے کوچے میں آفتاب کی طرح
کہ میں نے در سے بوسے کہاں کہاں کے لیے

گلو پیاس سے تھا خشک ، اہلِ معنی کا
کفِ سخا سے ترے گھونٹ ایاغِ جاں کے لیے

ہنر ہے سایۂ گردوں میں، سایہ ساں بے قدر
پھرا کیا کیے محفوظ سائباں کے لیے
سخن نے عرض کیا، عجز دستگاہ سخن
خس دہن ہے قلم، بلبلِ بیاں کے لیے
فضائے تنگِ جہاں نے زراہِ تنگدلی
جگہ نہ دی مرے طائر کو آشیاں کے لیے
مری بغل میں تڑپتے تھے میرے لختِ جگر
روان فزائی امید نسیم جاں کے لیے
ہوائے شوق ترے در پہ لے گئی ناگاہ
خضر کے ساتھ ہوا، عمر جاوداں کے لیے
نہیں اگر شرفِ بوالبشر، نہ ہو میں نے
تری گلی میں مزے دعوتِ جناں کے لیے
طرارے بھرنے لگا تیرے فیض سے، ورنہ
علف نہ تھا فرسِ رائضِ بیاں کے لیے
مرے کلام کو بخشی حیاتِ لافانی
ہوا یہ معجزہ اس عیسیٰ زماں کے لیے
سخن کو جو دے رونق، تو جو دکو تجھ سے
شرف ہے دولتِ معنی سے ہر بیاں کے لیے
عطا ہے تیرے لیے اور ثنا ہے میرے لیے
بیاں ہے تیرے لیے اور تو بیاں کے لیے
بیاں بقول اسد کس کی مدح میں نے لکھی
"کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے"

مثنوی درصفت انبہ :

مرزا غالب کی آموں سے رغبت ان کی زندگی کا جز لاینفک ہے ۔ اس پر ان کے سوانح نگاروں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ انھیں آم اس قدر مرغوب تھا کہ اس کی فصل میں وہ نہ صرف اسے بازار سے منگواتے بلکہ اپنے بعض دوستوں سے تقاضہ کر کے دور دور سے بلواتے تھے ۔ اسی شوق نے ان سے وہ مثالی مثنوی کہلوائی جو "مثنوی درِ صفتِ انبہ" کے عنوان سے ان کے دیوان میں شامل ہے ۔

بیان آموں کے شوقین تھے یا نہیں ۔ اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ۔ لیکن ہے یہ حقیقت کہ جب ان کے ایک عزیز دوست منشی نادر علی وکیل نے ان کے لیے تحفے میں آم بھجوائے تو اس تحفے کو پا کر وہ اس قدر مسرور ہوئے کہ "نبات حسن" کے عنوان سے غالب کی مثنوی کی زمین میں ایک پر زور مثنوی قلمبند کی اور اس میں آم کی خوبیوں کو لطیف پیرائے میں اس طرح واضح کیا :

فیضِ حق سے شکر فشاں ہیں آم — تحفۂ نادرِ جہاں ہیں آم
یہ چمنِ نادری کا تحفہ ہے — منشی نادر علی کا تحفہ ہے
آم دنیا میں نام اسی کا ہے — چشمۂ فیضِ عام اسی کا ہے
انبۂ نغز کہتے ہیں اس کو — ہے بہارِ ریاضِ انبہ گو
ہر زباں اک شکر تری کر دی — اس نے شکر کی کرکری کر دی
بس کہ ہے برتری محال اس پر — شہد شیریں کی ٹپکی رال اس پر
داغی ہے ماہتاب کا سرہ — ریشہ دار آفتاب کا زردہ
یاں جمے خاک، رنگ گلناری — قند ہاری تو کیا ہے قندھاری
ہاتھ آسیبِ شک سے ٹل جائے — سیبِ کشمیر پر چھری چل جائے

کیوں نہ اس کی طرف بشر لپکے — جن کا ڈر ہے نہیں یہ، وہ ٹپکے

نخل ایسا کوئی نہاں کہاں — نیشکر کی گرہ میں مال کہاں

کیوں نہ ہو سبز، نیشکر کی بہار — اس کے لشکر کا ہے علمبردار

اس سے باغی اگر ذرا پائیں — لوگ پونڈے کا پوست کھنچوائیں

اس کے دربار میں ہے پیوستہ — حاضر اک پانو سے کمربستہ

اس نے شاید عتاب فرمایا — یوں جو کولھو میں اس کو پلوایا

ہے یہ شیریں کہیں نمک سے زیاد — شور ہے اس کا تا ملیح آباد

ممتنع شہد اس کا جام ہوا — بمبئی کا اسی سے نام ہوا

دی ہے مولا نے اس کو گلشن میں — پرورش، انبیا کے دامن میں

ہے یہ شیریں درختِ باغِ ارم — برگ پوشی ہے جامۂ آدم

اس صفا پروری کی پہنچی خاک — قندِ مصری ہے پر خس و خاشاک

اس کا رس بات بات میں کہیے — شاخ کیلا ہے نبات میں کہیے

لعلِ معشوق کے پڑے لالے — اس پہ ٹوٹے جو چوسنے والے

کوہکن قاش اس کی ہاں چوسے — تا نہ شیریں کی پھر زباں چوسے

آم اگر کام میں ہو شکر ریز — نام شکر کا پھر نہ لے پرویز

خواہشیں اس کی راہ تکتی ہیں — شہد پر مکھیاں بھنکتی ہیں

سرخ ہے شوخ ارغوانی پوش — زرد معشوق زعفرانی پوش

رنگ دلکش ہے اس کی زردی کا — زعفراں پر ہنسی نہیں بے جا

کیوں نہ اس کا ہو شور تا عیوق — ہے یہ ہم رنگِ عاشق و معشوق

کان میں جھمکے کیہ رہی ہے ڈال — جتنے اس رنگ کے ملیں انھیں پال

پھونس میں اس کا رنگ شعلہ فروش — اس کو کہتے ہیں آتشِ خس پوش

کیوں نہ رنگولہ نس ہو اس کی ڈال — ہے یہ ہر میوے کا گرو گھنٹال

ہے چمن میں یہی بلند نشاں — نہ کہو شہد کو رفیع الشان

اس کی سیوہ بہار کا شیوہ — اس سے بہتر نہیں کوئی میوہ
لقمہ ایسا کوئی بنا دیجے — کہ اُگل دیجے اور نگل لیجے

اس سے شیریں جہاں میں کون ہے گر — ہے بیاں کا کلام شیریں تر
نطق میں رس ہے انبہ تر کا — شکریہ ہے جواب شکر کا

اے بیاںؔ طولِ داستاں ہے فضول
ہو یہ سرکارِ نادری میں قبول

بیانؔ نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غالب کی "مثنوی در صفتِ انبہ" کے ابتدائی ۹ شعروں پر تضمین بھی کی۔ اس میں بیان نے آم کی مٹھاس پر شاعرانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے اور غالب کے شعروں کے اسرار و رموز کو کھولا ہے: دیکھیے۔

آج پھولا ہے بوستانِ نیاز — لائی شاخِ نیاز میوۂ ناز
ہے یہی عندلیب ہم آواز — ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

یاں شکر ریز داستاں ہونا — ہے ورق کا شکرستاں ہونا
نطقِ شیریں کا ہمزباں ہونا — خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

کلکِ گلریز کو صبا کہیے — برگِ گل لے کے مدعا لکھیے
لذت انگیز ماجرا لکھیے — مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

کاغذ اطرافِ گلستاں ہو جائے — صفحہ قند کی دکاں ہو جائے
جودِ نادر علی عیاں ہو جائے — بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے

خامہ ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم سے کام شکرستاں ہے　　قندِ مصری جگر بہ دنداں ہے
لنگ پائے شکر گریزاں ہے　　آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمر و شاخ ، گوے و چوگاں ہے

شاخ سے ہے نباتِ خس بدہاں　　غم سے حلوائے تر نہ ہو سو ہاں
قند کی کرکری ہوئی رز ہاں　　تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوے اور یہ میداں

اس سے از ذوق کون تنگ ناک　　کوزۂ قند ہے خس و خاشاک
رشک سے اس کے ہیں شریفے چاک　　آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

کتنا رنگیں ہے دیدہ ور بد دور　　مے سے گویا ہے لعل گوں بلّور
کیا دختر نے چاک پردۂ زور　　نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

آبِ خضر سے داغ دھونا ہے　　نام گلزار کا ڈبونا ہے
رشک کے آنسوؤں سے رونا ہے　　یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

قطعہ در تشابیہ کوزۂ قند کالپی :

قطعہ ذیل ، غالب کا ایک معرکتہ الآرا اور بے مثل قطعہ ہے جو ان کے قیام کلکتہ (۱۸۳۰ء) کی یادگار ہے ۔ اس میں مرزا نے عدیم المثال تشبیہات کو اپنی جدتِ فکر سے بڑی ہی روانی اور صفائی سے نظم کیا ہے ۔ اس کی شانِ نزول کے متعلق مولانا الطاف حسین حالی ، نواب ضیاء الدین

احمد خان کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں :۔

۱۸۷۱ء میں جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے ۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا ، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا ۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے ۔ اس پر بات بڑھی ۔ اس نے کہا فیضی جب پہلی بار اکبر کے روبرو گیا تھا ۔ اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا ۔ مرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں ۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو ۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا ۔

اس قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے :

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

بیان نے اپنا قطعہ اسی قطعہ کی تقلید میں کہا ہے۔ اس میں انھوں نے بھی غالب کی طرح جگہ جگہ بے مثل تشبیہات سے کام لیا ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو چلنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیے: ہے

میرے محسن نے جو بھیجا ہے مجھے کوزۂ قند
بستہ اس کوزے میں احسان کا دریا کہیے
سر فرد بردہ تفکر کہ اسے کیا کہیے
لب فرو بستہ تکلم کہ اسے کیا کہیے
سیر خمیازۂ صد گونہ تمنا کہیے
کسی محبوب کا شیریں دہن وا کہیے
معنی جوہر شفاف تماشا کہیے
صورت یوسف مصری کا ہیولا کہیے
بصفا آئینۂ دست سکندر لکھیے
بضیا آئینہ دار کف موسیٰ کہیے
قالب صنعت رخسارۂ سلمیٰ لکھیے
نار بیدانۂ پستان زلیخا کہیے
نو گل کوزۂ گلزار ارم کیجے رقم
ساغر نقرۂ فردوس مطرا کہیے
خیمۂ گوہر حوران بہشتی لکھیے
کنگر بارگہ قیصر و کسریٰ کہیے
سینہ بند صنم پردہ نشیں کیجے فرض
کلۂ تازہ جوانان خود آرا کہیے
گوئے دستبوی اصحاب طرب کیجے یقیں

جامِ سیماب اسے اربابِ عمل کا کہیے
سیمگوں پرِ میزانِ طبرزد لکھیے
نقرئی حقہ، پرِ لولوے لالا کہیے
سپرِ تلخیٔ ایامِ مصیبت لکھیے
خودِ شمشیرِ ستم آلودۂ ایذا کہیے
ہمسرِ بیضۂ طاؤسِ نگاریں لکھیے
حوضِ آزادیٔ مرغانِ شکر خا کہیے
منجلی پیکرِ ماہِ شبِ ہفتم لکھیے
ظرفِ قندیلِ درِ کعبۂ والا کہیے
سمِ سیمیٔ فرسِ چابکِ شیریں لکھیے
سرِ پرویز خیالِ شکر آما کہیے
سنگِ قالینِ سلاطینِ مظفر لکھیے
ساتگینِ طربِ سنجر و دارا کہیے
کیوں اسے کیسۂ دلاک سے دیجے تشبیہ
کیوں اسے بوتۂ سباک سے مانا کہیے
کیوں اسے ساغرِ بلور سے بہتر لکھیے
کیوں اسے کاسۂ فغفور سے بالا کہیے
کیوں اسے تازہ حبابِ لبِ کوثر لکھیے
کیوں اسے آمۂ شیرینیٔ معنیٰ کہیے
طبقِ سیم کو عرشِ صمدی کیجیے فرض
اور اسے قمقمۂ عرشِ معلیٰ کہیے

غالب کی زمین میں بیانؔ کا سہرا:

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

غالب نے یہ سہرا بہادر شاہ ظفر کے بیٹے شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر کہا تھا۔ رنگینی، جدّت، ندرت اور معنی آفرینی کے لحاظ سے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس میں لعل و یاقوت اور گوہر و الماس جڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک ایک شعر لطافت اور دل آویزی لیے ہوئے ہے۔ اس کے مقطع کی سخن گسترانہ بات کے جواب میں ذوق نے اسی زمین میں سہرا کہا اور اس میں اپنا سارا زورِ فکر صرف کر دیا۔ بعد کے شعرا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی اور اپنی صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھائے۔

بیان نے بھی اس میں اپنی جولانیِ طبع کا مظاہرہ کیا ہے اور یکے بعد دیگرے دو سہرے کہے ہیں۔ پہلا سہرا حافظ محمد عبد الکریم، خان بہادر سی آئی ای، رئیس اعظم میرٹھ کے دو بیٹوں شیخ نظام الدین اور شیخ علاؤ الدین کی شادی کے موقع پر کہا ہے اور دوسرا سہرا مولوی وحید الحق صاحب، امین تحصیل ہاپوڑ کے بیٹے مولوی محمد منظہر الحق کی شادی کے وقت قلمبند کیا ہے۔ ان دونوں سہروں کے چند منتخب اشعار قلمبند کیے جاتے ہیں: ۹ے

جلوۂ شانِ کریمی کا ہے مظہر سہرا
پرتوِ نورِ الٰہی ہے سراسر سہرا
اب جائے کہاں، طائرِ دل، مرغِ نگاہ
گھات میں ہے تہِ گلدام چھپا کر سہرا

خطِ گلزارمیں کی زر سے رقم سورۂ نور
ورقِ مصحفِ عارض کا ہے مسطر سہرا
خوب تاروں کی زمیں پر ہے یہ پھولوں کا فلک
کہ تلے عارضِ پُرنور ہے اوپر سہرا
چڑھ کے سر آئینۂ رخ کی بہاریں لوٹیں
اللہ اللہ رے قسمت کا سکندر سہرا
گرمیِ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی
بن گئے رخ کی شعاعوں میں الجھ کر سہرا
ٹکٹکی خضر و مسیحا نے لگا رکھی ہے
حوریں لائی ہیں رگِ جاں میں پرو کر سہرا
دھوپ بنتا ہے کبھی، چاندنی بنتا ہے کبھی
شعبدے کرتا ہے پردے سے فسوں گر سہرا
خندۂ صبح کے گل، لمعۂ خورشید کے تار
نور کی جان، صباحت کا ہے پیکر سہرا
ذوق و غالبؔ نہیں اب ہیں بیاں، داغ و امیر
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

کیوں نہ ہو جلوہ فزائے رخِ انور سہرا
مظہرِ نورِ خدا ہے ترا مظہر سہرا
روئے پُرنور سے قسمت جو لڑی اک اک کی
بن گیا سلکِ گل و گوہر و اختر سہرا
گوندھیں آنکھوں سے نہ کیوں تارِ نظر حوروں کا

لایا فردوس سے گل، پلکوں سے چن کر سہرا

جوہرِ حسن ہے لیکن نگہِ شوق کی طرح

نکل آیا ترے آئینے سے باہر سہرا

اے سعیدِ ازلی ہے یہ قرانِ السعدین

کیوں نہ ہو حسنِ سعادت کا ترے سر سہرا

صحبتِ نیک سے ہوتا ہے عیاں نیک اثر

کیوں نہ ہو روئے منور سے منور سہرا

بس کہ تھا شیفتہ حسن شبِ عقد کے بعد

کوئے گیسو میں رہا بھیس بدل کر سہرا

بندھ گیا تارِ بیاں کی شکر افشانی کا

بن گیا چاشنیِ قندِ مکرر سہرا

غالب کی غزل پر تضمین:

غالب کی مشہور غزل ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بیان نے اس غزل کی بے مثل تضمین کی ہے ملاحظہ کیجئے:

پھرکی ہے کہ ہے گنبدِ مینا مرے آگے

نیرنگ مہ و مہر ہے کیا کیا مرے آگے

دو مہرۂ بازیچہ ہیں گویا مرے آگے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک بلبلہ ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک
اک لہر ہے انگیزشِ امکاں مرے نزدیک
اک سحر ہے نیرنگِ بہاراں مرے نزدیک
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز باد نہیں کوکبۂ جم مجھے منظور
جز سایہ نہیں نیرِ اعظم مجھے منظور
جز گرد نہیں گردۂ آدم مجھے منظور
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

کھولے ہے کمر کوہ قوی پا مرے ہوتے
سر نخل سے ٹکرائے ہے نکبا مرے ہوتے
کچھ قیس ہی پنہاں نہیں ہوتا مرے ہوتے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

آوارہ ہوں گردِ قدم آسا ترے پیچھے
ہمرنگِ سرِ زلف ہے سودا ترے پیچھے
کیا کہیے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

طوطی کی روش زمزمہ پیرا ہوں، نہ کیوں ہوں
مشہور بھی، شاہد بھی ہوں، اچھا ہوں، نہ کیوں ہوں

سر تا بقدم دیدۂ بینا ہوں، نہ کیوں ہوں
سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

کیا سر کہ جبیں، سرمہ کو دیکھتے ہیں یار
شیشے میں پری ہو تو پری خواں ہو نمودار
آگے ہو گلِ سرخ تو بلبل ہو گہربار
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

مسجد سے سوئے دیر لو کھینچے ہے مجھے کفر
کھنچتا تھا بہت دور سو کھینچے ہے مجھے کفر
زاہد مجھے ٹوکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عالم میں سلیماں پری کش ہے مرا نام
میرے لیے آوارہ ہوئے کعبے سے اصنام
بلبل مرے گلدام میں ہیں لاکھ، گل اندام
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے، لیلا مرے آگے

کھا بازیٔ ایام مقرر نہیں جاتے
عیش غلط انداز کے ادبر نہیں جاتے
اربابِ سکوں آپ سے باہر نہیں جاتے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے

آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

جاں دینی، بدیدارِ قدح سنتِ جم ہے
کچھ ہو نفسِ باز پسیں وقت کرم ہے
اے تم کو مرے وسعتِ مشرب کی قسم ہے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

زنہار بیاں، ہم تگ و ہم تاز ہے میرا
منجملۂ یارانِ ہم انداز ہے میرا
ہم مکتب و ہم رنگ و ہم آواز ہے میرا
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے

تیغِ ہندی :

تیغِ ہندی بیان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو مخطوطے کی صورت میں ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے غالباً بیان نے یہ نام غالب کے مجموعۂ خطوط عودِ ہندی (مطبوعہ ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) سے متاثر ہو کر رکھا ہے۔ یہ ہمیں بیان پر تحقیق کے دوران لال کرتی، میرٹھ کے رئیس خان بہادر شیخ بشیر الدین تسخیر میرٹھی (تلمیذ بیان میرٹھی) کے چھوٹے صاحبزادے بھیا غیاث الدین صاحب (ف: ۱۹۸۰ء) کے کتب خانے سے ۱۹۷۴ء میں فراہم ہوا تھا۔

مذکورہ مخطوطہ اچھی حالت میں ہے اور ۱۱ × ۸ سائز کے ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کل ۶۱ خطوط شامل ہیں۔ بیان نے یہ خطوط

اپنے رشتے داروں، دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔

غالب سے پہلے بھی مکتوب نگاری کا ذوق عام تھا اور ان کے عہد میں بھی مکتوب نگار تھے۔ جن کے مکاتیب کے مجموعے کتابی شکل میں موجود ہیں۔ مثلاً غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر اور قتیل وغیرہ۔ لیکن ہے یہ حقیقت کہ ان لوگوں کے یہاں القاب و آداب کی طوالت، مسجع اور مقفیٰ عبارتوں کی بھر مار اور فارسی انشا پردازی کی نقالی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ غالب نے ان سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی۔ ان کے خطوط میں جو زندگی، کشش اور صاف ستھری عام فہم زبان ملتی ہے وہ ان مکتوب نگاروں کے یہاں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس کثرت و ضابطے سے خطوط ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدینِ ادب نے غالب کو اردو کا پہلا باقاعدہ مکتوب نگار تسلیم کیا ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں زندگی کو فن پر ترجیح دی۔ روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے قلمبند کیے۔ اپنی شخصیت کا رس نچوڑا۔ آپ بیتی سنائی۔ لوگوں کے دکھ جھیلے۔ شاگردوں اور دوستوں کو پُرخلوص مشورے دیے۔ علمی و ادبی بحث کی۔ اپنے بعض پیچیدہ اشعار کے معنی بیان کیے۔ یہی نہیں بلکہ سادہ اور پُراثر اسلوب سے اپنے خطوط کو سنوارا۔ انھیں اپنی خداداد صلاحیتوں سے رفعت و بلندی عطا کی اور مکالماتی انداز اختیار کر کے جاندار اور پُرزور بنایا۔ اگرچہ غالب کے بعد کئی ادیبوں و شاعروں نے اس صنفِ ادب کی جانب توجہ دی لیکن ان میں سے کوئی بھی غالب کا مقلد نہ بن سکا۔ تاہم اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اردو میں مکتوب نگاری کا

چلن عام ہوا اور اس کے سرمائے میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔

مکتوب نگاروں کے اس گروہ میں بیان بھی شامل ہیں۔ ان کی مکتوب نگاری کی ابتدا عودِ ہندی کی اشاعت (۱۸۶۸ء) کے فوراً بعد غالباً ۱۸۷۰ء کے آس پاس ہوتی ہے۔ [۱۱] اگر ان کے خطوط کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں طرزِ تحریر اور اسلوب کے لحاظ سے دو طرح کے خطوط ہیں۔ پہلی قسم میں وہ خطوط شامل ہیں جن کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے یعنی وہ فارسی مکتوب نگاری کا انداز لیے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ زیادہ تر خطوط ایسے ہیں جو سلیس، سادہ، عام فہم اور غالب کے طرزِ تحریر میں ہیں۔ ان میں طویل القاب و آداب بھی نہیں ملتے بلکہ بیان کبھی مکتوب الیہ کے نام سے خط لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی حسبِ مراتب کسی لفظ کا استعمال کر کے اپنے مکتوب الیہ سے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے خطوط میں غالب کی طرح مکالماتی انداز، شوخی و ظرافت، علمی بحث، زبان کی سادگی، محاورے اور شعروں کا برجستہ استعمال، حسنِ طلب، سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ یہ ان کے خطوط کی دوسری قسم ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں چند خطوط نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بیان نے اپنے خطوط میں غالب کی کس حد تک تقلید کی ہے اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

بنام سید مہدی علی [۱۲]

اعلیٰ حضرت مدظلہٗ ــــــ تسلیم

اربابِ تشریح کہتے ہیں کہ ام الدّماغ کے جوف میں نور کا خزانہ خلاّقِ حقیقی نے مرتب کیا ہے۔ وہیں سے جو رگیں کہ باہم تقاطع کر کر آنکھوں میں پہنچتی ہیں، گویا زلالِ نور کی موریاں اور آنکھیں اس کی نہالی اور ہم اس نور سے دیکھنے والے۔ میری دانست میں یہ تو حکیموں کا ڈھکوسلا ہے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آفتاب ہماری نگاہوں سے ڈوب جاتا ہے تو پھر ہم کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ گویا آنکھیں بیمار ٹھہریں اور آفتاب کی شعاعیں اس کا عصا۔ بیمار بے عصا کے دو قدم چل نہیں سکتا، اسی طرح آنکھیں بے آفتاب کے دو وجب دیکھ نہیں سکتیں۔ بھلا جب یہ ٹھہرے تو ہم کو کیا نظر آئے۔ دنیا آنکھوں میں تاریک کیوں نہ ہو جائے کہ ہمارا آفتاب جو صیقلِ آئینہ کون ہے۔ کون ہے؟ وہی جو ورائے حجابِ جالون ہے۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ نہیں نہیں اپنے امام کی پیروی مدِ نظر ہے یا یوں کہیے کہ اپنے مبارک ہم نام کی اطاعت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو صحیح آپ جہاں ہیں وہیں اجالا ہے، وہیں نور ہے۔ یہ کہیے کہ ہم جہاں ہیں، وہاں کیا ہے اور ہم پر کیا کچھ گزرتی ہے۔ یہ تو بیانیہ مضمون اور شاعرانہ خیالات تھے کیوں کہ گو:

"پرتوِ آفتاب کے، ذرے میں جان ہے"

لیکن ابھی آنکھیں دھندلی ہیں یعنی یہ کہنا کہ ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے، غلط ہے۔ جو مصیبت کہ کوئی نہ دیکھ سکا، ہم نے دیکھی۔ اسی طرح ہم ناتواں بھی نہیں۔ جو غم کہ کوئی نہ اٹھا سکا، ہم نے اٹھائے۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال، بنامِ منِ دیوانہ زدند

آپ کا صحیفۂ گرامی یا یوں کہیے کہ پیار کی پڑیا، لاڈ کی صندوقچی میرے پاس آئی۔ جوں ہی سرنامہ کی مہر اٹھائی، یہ معلوم ہوا کہ نافہ کا منہ کھولا۔ ہائے ہائے کیسی مستانی التفات کی خوشبو منتشر ہوئی کہ دماغ کو گل شگفتہ کر دیا اور کیسی کریمی کی نسیم جھوم کر نکلی کہ مرجھائے ہوئے دل کو باغ باغ کر دیا۔ یک بیک آپ کی عبارت گرامی جوں ہی پڑھنے لگا تو میری آرزوؤں کی مستورائیں، پردۂ چشم کے قریب آکھڑی ہوئیں۔ وہ یوں سمجھیں کہ ہمارے اعلیٰ حضرت سے زبان گستاخ تڑاق پڑاق باتیں کر رہی ہیں۔ جب آنکھوں میں آکر دیکھا تو ہاتھ میں ایک پارۂ کاغذ پایا۔ آپ کا چہرہ نظر نہ آیا، اس وقت وہ کیا کہوں کہ کس حسرت سے اپنے بیت الحزن یعنی دل کو یہ شعر پڑھتے ہوئے لوٹ گئیں:

ازدرِ دوست چہ گویم، بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم

حقیقت میں بڑی دردناک عبارت لکھی ہے۔ بعض فقرات پر بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ ابرِ بہار کی طرح زار زار روئیے اور مرغ شاخساری کی طرح پکار پکار نالہ کیجیے۔ اللہ اکبر کیسی کچھ دلدہی کی ہے کہ ایک ناقص، خانہ خراب کو کامل فرمایا ہے اور پھر اس افراط کو کیا کہوں کہ اپنے سے کسی امر میں زیادہ:

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

آپ کا بھانجا ابھی اس لائق کا ہے کو ہے کہ کوئی اسے بعد مرگ یاد کرے اور یہ توقع کہ اس کا نام فہرست محصلین میں درج ہو:

تہمت آلودۂ عیشیم بہ گلشن زادیم

پردہانی نہ کشادیم کہ صیاد آمد

بلکہ اس ننگِ کونات کو دنیا میں چھینگے کی چھٹی انگلی کہنی چاہیے ، جو موجود ہونے میں بدنام ہے مگر کسی کام کی نہیں :

نہ ثمر ، نہ سایہ دارم ، نہ گل و نہ برگِ عیشی
ہمہ حیرتم کہ دہقاں ، بچہ کار کشت مارا

آپ نے دو تین فقرے جو اپنے باب میں لکھے ہیں ، نشتر تیز تھے کہ دل میں چبھوئے گئے یا نیزوں کی سنانیں کہ جان میں گڑو دی گئیں ۔ دیر تک سکتے میں رہا ۔ کچھ روتا ، کچھ بکتا رہا ۔ داروغہ سے روپے وصول ہو گئے کتابوں کی کیفیت نہ پوچھیے اس سال اچھی اچھی کتابیں اللہ نے بہم پہنچائی ہیں ۔ جس میں شرحِ صحیفۂ کاملہ بھی ہے ۔ میں بھائی کی طرف ایک دری کی کوٹھی میں رہتا ہوں ۔ تعدادِ مکانات ، سببِ حسرت نہیں ۔ کیوں کہ :

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں ، یاں رہ گیا ، واں رہ گیا

بھائی صاحب کو آپ کا خط دکھا دیا ۔ کہتے تھے کہ آہ آہ چند روزہ عمرِ کاغذ فضول کی ہے ، لوٹ پوٹ میں بسر ہو جائے گی ۔ ایسے لوگوں کی صحبت اور خدمت کی حسرت ہے ، حسرت رہ جائے گی ۔ کیا اگر دو سال میں ایک ماہ کو آئے تو مشتاقوں کی آنکھیں سیراب ہو گئیں یا دل شاداب ہوئے ۔ نہیں نہیں دنیا دارِ سرور نہیں ۔ قلم جس طرح چلا ہے وہی نقش صفحۂ ہستی پر پیدا ہو کر رہے گا ۔

ماموں جان بوسہ تو گنج ہائے لب میں اس طرح تڑپ رہا ہے جیسے دِگ

میں خون ۔ یہ کیوں کہیں کہ آپ کے قدم میں تو چوم لیجیے ۔ نظارہ تو آنکھوں میں یوں سسک رہا ہے ، جیسے قفس میں مرغ ۔ یہ کیوں کہیں آپ کا جمال ملے تو گود میں بھر لیجئے ۔ فقط ۔ (تیغِ ہندی ۔ ص : ۱ ۔ ۵)

— ۲ —

بنام ایڈیٹر لارنس گزٹ (پنجاب)

ایڈیٹر صاحب ـــــــ سلامت

انجمن پنجاب مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۷۷ء میں کسی صاحب نے بطور ظرافت، نہ بطور حقیقت پوچھا ہے کہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کیوں نہیں کہتے ۔ جواب : پہلی غلطی جو سائل کی تحقیق میں ہوئی ہے ، لفظ زمین کو عربی سمجھنا ہے ۔ یہ لفظ کرہ خاک کے معنی میں عربی نہیں عجمی ہے ۔ اس کی اصل " زم " ہے ۔ زم لغت میں سردی کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ فصلِ سرما کو " زمستاں " بولتے ہیں ۔ چوں کہ مٹی کی تاثیر سرد ہے لہٰذا حکمائے عجم نے باعتبارِ سردی کے خاک کا نام زمین رکھا ۔ نہ باعتبارِ بے حرکت ہونے کے ۔ ی اور ن اس کلمہ میں نسبت کے ہیں جیسے غمیں اور کمیں (یعنی غم والا اور کم والا) اس پر دوسری حجت یہ ہے کہ اگر لفظ عربی مانا جائے تو ظاہر ہے کہ اصل اس کی " زمانت " ہے جو بمعنی تنگی کے آیا ہے اور " ان " زمین میں اصلی ٹھہرا جاوے گا ۔ اس کو گرانا کسی طرح جائز نہ ہو گا ۔ حالانکہ بعض مواقع پر شعرائے عجم نے ن نسبت محذوف کیا ہے ۔ چنانچہ نظامی ، شرف نامہ سکندری میں لکھتا ہے :

خرامندہ بر سبزۂ آیں زمی

خیالی نہ بیند بجز خرمی

پس حیران ہوں کہ سائل نے اپنے اختیار میں کیوں خطا کی ہے اور وہ ایک امر بے حقیقت کا ہونا کیوں چاہتے ہیں ؟ کیوں وہ حیثیت کہ واضع نے جس سے موضوع لہ' کے لیے اس لفظ کو وضع کیا ہے ہنوز اس کے موضوع لہ' میں موجود ہے۔ پھر تبدیل نام کے کیا معنی ؟ ہاں زمین عربی میں آیا ہے جیسا کہ گزرا۔ معنی اس کے مثلوں کے ہیں۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ اگر دو زبان کی لغت ہم جنس واقع ہوں تو وہ ایک ہی چیز کے نام قرار دیے جائیں۔ عربی میں زمین کے لیے لفظ ارض ہے اور آسمان کے لیے سماں، نہ کہ زمین و آسماں۔ یہ تو فارسی ترکیبیں ہیں۔ پس چوں کہ مدار اہل اسلام کا علمائے عرب کی رائے پر ہے لہٰذا بے ان کے تجویز و تسلیم کے کوئی احداث نہیں ہو سکتا۔ اس کی سوا یہ ہے کہ عربی، فارسی اہل اسلام کی زبان ہے اور زمین، آسمان یا ارض و سما انھی زبانوں کے لفظ ہیں۔ اور اہل اسلام نظام جدید کے منکر۔ پھر وہ اسم خلاف مسمیٰ کیوں کر تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہاں حکمائے انگلستان اپنے زمین آسمان بدل لیتے ہیں۔ یہاں تو زمین آسماں بدل جائے مگر نہیں بدلتے۔ ریاضیات میں علمائے حکمائے اسلام کو زمین کی گردش اور فلک کے آرام میں بہت کچھ کلام ہے، جن کے دلائل کو میں نہیں دیکھ سکتا کہ کوئی اٹھائے۔ رہی حکمت شہودی، اس کا مدار دوربین پر ہی جائز ہے کہ جو بات حکمائے فرنگ دیکھتے ہیں شیشے کی تاثیر ہے یا اندیشے کی۔ اس کے دلائل واضحہ اپنے مقام پر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے لہٰذا اس سے قطعِ نظر کر کر کہتے ہیں کہ اہل اسلام کے نزدیک جو چیز شرع سے ثابت نہیں ہوتی اس کو نہیں مانتے۔ فلک کا

چکر کھانا قرآنِ کریم سے ثابت ہے۔ اور میں ایک نئی دلیل بیان کرتا ہوں جس میں نیچری بھی حیران ہوں گے۔ سائل پہلے کہہ چکا ہے کہ زمین و فلک کے نام باعتبار ان کی حالت کے رکھے گئے تھے۔ چنانچہ فلک کو فلک اسی لیے کہا ہے کہ وہ تکلی کے چمڑے کی طرح گھومتا ہے۔" جاراللہ زمخشری" نے "اساس اللغت" یوں لکھا ہے کہ۔ "الفلک یسمی بالفلک لتدویرہ کفلکۃ المغزل"۔ پس درحالیکہ فلک باعتبار گردش فلک پکارا گیا۔ دو حال سے خالی نہیں۔ یا باعتبار نظام بطلیموسی صحیح تھا یا باعتبار نظام فیثا غواسی غلط۔ اگر شق اول صحیح ہے تو فلک کہنا جائز والّا غلط۔ اب قرآن میں دیکھو کہ اسما کو فلک فرمایا ہے۔ چنانچہ "وکل فی الفلک یسبحون"۔ پھر جو فرقہ کہ قرآن کے خلق کا قائل نہیں اور کلام الٰہی کو ازلی و ابدی مانتا ہے اور اسلام میں ایک سوادِ اعظم ہے اس کے نزدیک فلک سوائے فلک اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اللہ جلّ شانہٗ کا علم حضوری ہے۔ پھر وہ ازل میں خلاف واقعہ کسی شے کا نام کیوں رکھ دیتا۔ پس معلوم ہوا کہ فلک کا سکون خلافِ شرع ہے جس کو اہل اسلام تسلیم نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔

منشی جی عالم کی ایسی کیا کایا پلٹ گئی کہ زمین کو آسمان، آسمان کو زمین کہیں۔ ہاں اگر یوں کہیے کہ آخر الزماں ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ فتنے برپا ہیں۔ زمین و آسمان میں انقلاب ہے۔ یہ وہ ہوئے۔ وہ یہ ہو گیا، تو یہ بات دوسری ہے۔ فقط (تیغ ہندی: ص: ۵-۸)

—— ۳ ——

بنام مولوی حسین احمد

چیں قبائے سعادت، طرف کلاہ وجاہت، عزیزی مولوی حسین احمد

آنے کو کہ گئے مگر آئے نہیں ہنوز
گویا کہ آنا آپ کا کہنے کی بات ہے

بہار ہر سال آتی ہے۔ چاند ہر ماہ نکلتا ہے۔ قریب دس مہینے ہوئے کہ تم اس غریب تک آئے تھے۔ نہیں نہیں دس سال گزر گئے، جب مولوی حسین احمد تشریف لائے تھے۔ توبہ توبہ ابھی یزدانی صاحب ہوش کی لیجیے۔ فریب نہ دیجیے۔ ایک ہی ہفتہ تو گزرا ہوگا کہ میں آپ کے غمکدے میں گیا تھا۔ جا کر آپ کو خوشنود کیا تھا۔ آپ بھی کوئی عجیب تماشا ہیں۔ ایک ہفتے کو دس ماہ یا دس سال بتاتے ہیں۔ ابا عزیز من تم بات کی تہہ کو نہیں پہنچے۔ میں جو کہتا ہوں سچ کہتا ہوں۔ بھلا حضرت کیوں کر؟ سنیے ایک ہفتہ نہیں آپ کو سوائے دس روز ہوئے۔ میں راتوں کو تارے گنا کرتا ہوں۔ کیا یہ چند روز نہیں گن سکتا۔ اچھا حضرت دس روز سہی۔ آپ نے ایک کالی لکیر کا اژدہا اور ایک کمباں کے بال کا کوّا کیوں بنا دیا۔ یعنی دس دن کو دس مہینے، دس مہینے کو دس سال کیوں فرمایا؟ بھائی حسین احمد یہ بات کہنے کی نہیں مگر کہی جاتی ہے۔ کیا تم کو اپنے کسی حقیقی دوست سے جدائی نہیں ہے؟ رہی تو کیوں بیٹھ رہے۔ حق یہ ہے کہ دو.ی کی ایک گھڑی، گرمی کا ایک مہینہ۔ جدائی کی ایک گھڑی، قیامت کا ایک سال ہے۔ تو میں نے کیا برا کیا ہے۔ عرفی کہتا ہے:

ہمیں بس است، دلیل بقائے عالم عشق
کہ یک شب غم او، در ہزار سال گزشت

فقط (تیغِ ہندی۔ ص: ۸-۹)

۴

بنام سید یعسوب الدین، ایمن کونچ، ضلع جالون

عزیز تر از جانِ نازنیں

دعا اور پھر دعا اور پھر دعا۔ میں نے اس شراب کو سہ آتشہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ اس کے نشہ کا عروج، دماغِ عرش تک رسا ہو۔ میں نے اس تند کو سہ کرر کیوں بنایا؟ اس لیے کہ اس کی عذوبت، لبِ اجابت پر ذوق فزا ہو۔ آمین ثم آمین۔ تم سے بات کیے ہوئے مدت ہوئی۔ ایک آدمرتبہ قلم کی زبانی کچھ پیام سلام ہوئے تھے مگر بیچارہ پائے چوبیں رکھتا تھا بوجہ عذرِ لنگ معذور رہا اور بساطِ مکالمت سے دور دور۔ اب چوں کہ دیر گزری اگرچہ بخیر گزری کہ تمہارے خط کا سبزہ کاغذ کے شبستاں میں لہلہاتا نہیں دیکھا اور تمہاری عبارت کا بلبل مکتوب کے چمنستاں میں چہچہاتا نہیں سنا۔ اس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی۔ اسی سے کانوں کو خنکی۔ لیکن ہم ایسے زمرد بخت کہاں کہ کہیں سبزہ دیکھیں اور نہ ایسے فیروزہ طالع کہ کہیں زمزمے سنیں۔ خیر چاہا اسی کا ہوا، ہمارا نہ ہوا۔

تمہارے خط میں اکثر اس امر کی شکایت پاتا ہوں کہ مسافرت بری بلا ہے۔ مہاجرت میں سخت صدمہ ہے اور نیز تمہارے خط سے تمہارا تعلق خاطر، جو جانبِ اقارب ہے اکثر ٹپکا کرتا ہے۔ اس کا علاج میرے پاس ہے۔ وہ چند کلمے ہوں گے جو معجونِ فلاسفہ کی طرح اگر درجِ دل میں محفوظ رکھو گے، تمہارے عوارج روحانی کو مفید ہوں گے۔ یاد رکھو حکمانے کہا ہے۔ بلوغ الاعمال فی رکوب الاآلام۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب

تک گل شاخ کی تنگ گلی میں پھنسا نہ رہا اور غنچہ کی تنگ کوٹھری میں بند نہ ہوا۔ ٹہنیوں کے جھجوں پر بیٹھ کر نہ ہنسا اور سبزے نے جب تک زمین کی نازکیوں میں صدمۂ فشار نہ کھینچا، خوشی سے اس کا تار تار نہ کھلا۔

یونانی حکیم اکثر عین طوفان میں کشتیوں میں بٹھاتے تھے اور موجوں کے صدمات اٹھواتے تھے تا کہ حاصلِ آدمیت اور ماحصلِ مردی حاصل کریں اور رہِ مصیبت ڈگ نہ جاویں۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمانوں کا سال محرم سے شروع ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے حصّے میں سب سے اوّل غم آیا ہے۔

پس چاہیے کہ جو نعمت یا مصیبت نازل ہو اس پر صبر اور شکر کرو۔ جنابِ ختمی مآب ؐ نے فرمایا۔ "الایمان نصفان، نصف صبر، نصف شکر" یعنی ایمان دو حصّوں پر تقسیم ہے۔ آدھا صبر ہے، آدھا شکر ہے۔ پس اگر ایمان میں پوری ڈالنی چاہتے ہو تو دونوں کو نباہے جاؤ۔ خدا یار ہوگا۔ ہر حال میں مددگار ہوگا۔ زیادہ دعا۔

سید محمد مرتضیٰ یزدانی میرٹھ

(تیغِ ہندی۔ ص: ۱۸ - ۲۰)

۵

بنام عنایت علی اثر ماہرہ

آتش کہاں تک اپنی نوشتہ کو رووَں میں
لکھا نہ یار نے مری تحریر کا جواب

عنایت بے عنایت ـــــ سلامت

کیا عجب ہے کہ آئندہ مجھے خاموشِ مرگ آئے اور پھر نہ بول سکوں۔ یہ خط غنیمت سمجھو اور جواب لکھو۔ عرصہ ہوا کہ ایک خط اپنے رشتۂ امل سے درازتر اور آپ کے حوصلے سے فراخ تر بھیج چکا ہوں۔ نہ اس کا نشان۔ نہ اس کے جواب کا نشان۔ خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا۔ پر اس در پر:

"نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا"

تم سے ہرگز ایسی امید نہ تھی۔ اب تو ایک عرصہ ہوا کہ میں مرضِ موت میں گرفتار ہوں۔ زنہار امید باقی نہیں:

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

اس وقت خط لکھ رہا ہوں مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا لکھ رہا ہوں:

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

نہ تمہاری خبر، نہ میاں ولایت علی کی، نہ ان کی بیماری کی۔ اے بھائی جلد اپنا اور ان کا حال لکھو۔ سبحان اللہ:

غضب کا تلاطم ہے بحرِ جہاں میں
خبر آشنا کو، نہیں آشنا کی

اِدھر صفدر خان نے بھی یہی تغافل اختیار کیا۔ احمد علی کا ایک خط آیا تھا۔ میں نے اس غصے میں کہ وہ اور شخص کے ہاتھ کا تھا، جواب نہ لکھا۔ یقین بلکہ یہ ہے کہ وہ خفا ہو گیا ہوگا۔

ناچار دل سے تنگ، بتوں کی جفا سے ہم
فریاد ایک ہو تو کریں بھی خدا سے ہم

میں تمہارے پاس بڑا جنگی خط بھیج چکا ہوں۔ میرا کیا قصور؟ کیا وہ خط

پہنچا نہیں ؟ پہنچا تو سہی مگر جواب بھیجا نہیں۔

تغافل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

اور سنیے۔ آپ کی غزلیں اور قطعات سب درست کر کے بایں شکستگی ایک اور خط تیار کیا اور اس میں مولوی چراغ علی صاحب کی عبارت کا بھی جواب۔ مگر وہ خط میری طرح کھو گیا۔ بہت ڈھونڈتا ہوں پتہ نہیں۔ تم تو مجھ سے اسی وجہ سے خفا ہو گئے کہ غزلیات وغیرہ بن نہ سکیں۔ اے عزیز مجھ سے کون سا کام بنا کہ غزل بنتی۔ بایں ہمہ تمہاری نازک مزاجی کے ڈر میں اسی بیہوشی میں کچھ حواس جمع کر کے درست کیا۔ چنانچہ دیکھو مرزا نوشہ کی وفات کا قطعہ اس طرح درست کیا۔ بعد درستی جو غور کیا تو عدد میں کچھ تفاوت معلوم ہوا۔ بھائی میں نے قطعہ درست کر دیا اور جتنے عدد تم نے نکالے تھے اس کو نہایت عمدگی کے ساتھ بنایا۔ چنانچہ تم نے لفظ ید کا تخرجہ کیا تھا۔ دیکھو کتنا بے موقع تھا۔ انھی لفظوں کو الٹ پلٹ کر ایک صورت نکال دی ہے۔ چنانچہ سنو:

بادہ نوشِ شرابِ خانۂ قدس
فخرِ عرفی و رشکِ طالب حیف
منم امروز زندہ دی [۱۴] رفت
اسد اللہ خان غالب حیف ۱۸۶۹ء

جو حرف ید میں تھے وہی دی میں بھی۔ مگر میری سمجھ کا پھیر ہے۔ بارے قطعہ خوبصورت ہو گیا۔ مگر درستیِ اعداد کا مجھے ہوش نہیں۔ اس کو تم سمجھ لو۔ فقط (تیغِ ہندی۔ ص: ۲۵۔۲۸)

— ۶ —

بنام ولایت علی جادو[۱۵]

ـــــــ آئیے آئیے۔ تشریف لائیے۔ اہلاً وسہلاً۔ مرحبا۔ جزاک اللہ خیر الجزا۔ شکر ہے کہ کسی رد پہنچ گئے۔ ایک یہ کہ آگرہ تک۔ دوسرا شکر یہ کہ درجۂ قبول تک۔ آ گئے۔ جادو اب میں اچھا ہوں، اگرچہ بڑا ہوں۔ للہ ایسا غضب نہ کرنا۔ نوکری نہ چھوڑ دینا۔ چھٹی نوکری جڑتی نہیں۔ جس طرح ٹوٹی جڑتی نہیں۔ میں بہت زور شور سے تمہارے لیے پہلو نکال رہا ہوں۔ کوئی پہلو چل گیا تو سبحان اللہ ــــــ بیشک میں دل سے تمنا کرتا ہوں کہ تم آؤ۔ آپ کو مجھ کو دیکھو دکھاؤ۔ لیکن لو چلتی ہوگی۔ زمین جلتی ہوگی۔ کدھر منہ کرو گے۔ کہاں قدم دھرو گے۔

رہی تصویر۔ اس مصور کو کوستا ہوں۔ تصور میں کوئی صورت سوچتا ہوں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تو صورت نوچتا ہوں۔ مصور نقش آب کی طرح معلوم نہیں۔ مرقع عالم سے مٹ گیا ہے۔ صورت طلبی میں کامیابی نقش بال عنقا ہے۔ اب تک میری طرح میری تصویر بھی گم ہے۔ مصور نے وہ رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ نیرنگ سازیاں کی ہیں۔ صورت کش نہ تھا، صورت باز تھا۔ دم باز تھا نہ کہ دم ساز تھا۔ الغرض تصویر آ جائے گی تو فوراً بھیج دوں گا۔

رشک آتا ہے کہ میری تصویر تمہاری صورت دیکھے اور میں نہ دیکھوں۔ ہاں ہاں میں دیکھوں گا تو کیا ہو گا؟ پھر میں نہ رہوں گا۔ وہیں تصویر بن جاؤں گا کہ:

حیرت سے میں ادھر، وہ اُدھر تکنے سے چپ

تصویر جیسے دیکھے ہے تصویر کی طرف

لو باتیں تو ہو چکیں۔ اچھا آنا ہے تو آؤ، دیر نہ لگاؤ۔ اس خاکسار کے لیے مٹی کی صراحی لیتے آنا۔ فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۵۸، ۵۹)

۷

بنام بشیر الدین عاقل

داغ جنوں ہے خاطر بیدار کا چراغ
گل ہو گیا ہے بلبل بیمار کا چراغ

جڑواں کارڈ پہنچا۔ شگون وصل تھا۔ تم نے دو کو ایک کیا ہم نے ایک کو دو۔ تم نے مواصلت چاہی۔ ہم نے مفارقت بنا ہی۔ ایک پرزہ بھیجتا ہوں۔ ایک رکھتا ہوں:

کاش سے دو دل بھی ہوتے عشق میں
ایک رکھتے، ایک کھوتے عشق میں

"طوطی ہند" بلے بیچ دیا۔ دریں چہ شک۔ اپنی بلا سے چہ چہ کرے کہ خاموش ہو جائے۔ میرے پاس ہوتا تو تمہارا پاس رکھتا۔ ہم نے دور کیا، تم سے دور رہا۔ طوطے میں وفا کہاں۔ مزاج کیا پوچھتے ہو:

مومن ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد
ترسا محمدی شدہ عاشق ہما کہ بود فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۵۹ - ۶۰)

۸

بنام میر حیدر علی

میر صاحب
آپ کا کارڈ پہنچا مگر محسن کے نام ۔ آپ بھی محسن ہیں اور میں احسان مند ہوں۔
بہر حال نام کسی کا، نام ہمارا ۔ خطاب کسی سے، جواب ہمیں دیں گے ۔
ماشاءاللہ خوب بادِ ہوائی اڑاتے ہو کاغذ باد کی طرح ۔ چاہتے تھے کہ بالاہی
بالالطف اڑائیں، مگر ہماری پیٹھ سے بچ کر جاتے کہاں ۔ کارڈ ہمارے
ہی پاس رہا۔ مطبع میں کیا ہوتا ہے ۔ کالا سپید اور سپید کالا ۔ سپیدی
پر سیاہی چڑھاتے ہیں پھر اپنی سیاہی کو آپ ہی مٹاتے ہیں ۔ مگر لکھی ہوئی
نہیں مٹتی ۔ آئی ہوئی نہیں جاتی ۔ اخبار بھی چھاپتے ہیں، اجرت پر
چھاپہ بھی مار لیتے ہیں ۔ اب آپ اپنے عجیب الخلقت دوست کا بھی حال
سنیں ۔ بیمار ہیں، بیکار ہیں، دنیا سے بیزار ہیں، ہمہ تن زار ہیں،
بلکہ آزار ہیں، زحمتِ امراض سے ناچار ہیں، رحمتِ الٰہی کے طلبگار
ہیں ۔ بیٹھتے ہیں گھڑی کی طرح، اٹھتے ہیں چھپر کی طرح، چلتے ہیں جنازے
کی طرح ۔ خدا عفو و عافیت دے ۔ فقط

(تیغ ہندی ۔ ص : ۶۱)

۹

بنام منشی ابوالحامد، تحصیلدار جالون

جناب منشی حامد ـــــ سلامت
نیازنامے کے جواب میں آپ کا نازنامہ آیا ۔ میں نے دل لگی کی تھی ۔ تم کو
ولی کا لکھا تھا ۔ تم ماتھے پر سلوٹ دینے لگے ۔ غرض برا مان گئے ۔ معلوم
نہیں کس رنگ میں تھے کیا جان گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درحالیکہ دہلی تمہارا
وطن ہے تو اس کی مدح سرائی واجبی نہیں ہو سکتی ۔ لونڈی کو تو بیگم

کہتے ہو۔ گھر کے گدھے کا نام موہن رکھ لیتے ہو۔ جب خارِ وطن کو سنبل و ریحان سے بہتر کہا ہے تو آپ کا دعویٰ بیجا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو دہلی کی ردیت یا رعایت نہیں کرتے وہ کچھ بھلا لکھ جاتے ہیں۔ اور میرٹھ کی برائی آپ کو زبان پر لانا، حق نمک بھلا دینا ہے۔ کیا ظفر تیموری نہیں دیکھا جس میں شرف الدین علی یزدی بھی میرٹھ کو شہر لکھ گیا ہے اور امیر خسرو دہلوی شہر میرٹھ میں آن کر کسی مفتی صاحب کے یہاں نان و نمک کھا گئے ہیں۔ آنکھیں اور اعجازِ خسروی دونوں کھول کر دیکھو، پھر برا کہو ـــــ کیا خوب اگلے لوگ تو شہر بتائیں، آپ چھاؤنی بتائیں۔ اچھا صاحب چھاؤنی کو صدر کہتے ہیں اور دہلیز کو دہلی۔ تو میرٹھ والے صدر نشین ٹھہرے اور آپ دربان۔ اچھا ذرا یہ فرما دیجیے کہ صدر میں کون لوگ بستے ہیں اور دہلیز پر کون سے حیوان کا جماؤ رہتا ہے۔ رہے زبان دانانِ ہند و فصحائے ملک، ان کی ہر جگہ سند ہے۔ نہ دلی والوں، نہ لکھنؤ والوں کی۔ کیا کابل میں گدھے نہیں رہتے؟ اور کیا کعبے میں بت نہ تھے؟ علم و عمل باعثِ شرف ہے نہ کہ مکان و محل۔ میں اس مسئلے کو "حواس خمسہ" میں بحسن فیصل کر چکا ہوں۔ اگر حواس خمسہ درست ہوں تو اسے ملاحظہ کر لیجیے۔ زیادہ نیاز

(تیغ ہندی۔ ص: ۶۱، ۶۲)

۱۰
بنام سجاد حسین ریحانی [۲۸]

سروِ بے چمن، شمع بے انجمن، جانِ بیان و یزدانی سید سجاد حسین ریحانی مدظلہٗ ـــــ روشن ہو کہ جب سے تو نے بسبب ایذائے قریش

اس دیارسے ہجرت کی ہے، ہمارا رنگ ڈھنگ بدستور ہے۔ وہی دل ہے، وہی سینہ ہے، وہی ناسور ہے۔

اب اور ہم سے خط کی شکایت۔ عزیزمن خط اسے لکھتے ہیں جو دور ہوتا ہے۔ تم آٹھ پہر آنکھوں میں پھرتے ہو۔ تیس دن دل میں رہتے ہو۔ پھر نہ کہنا کیا کہتے ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی بار دل میں ولولہ آیا کہ ساری ملاقات نہیں تو آدھی ہی سہی۔ اجی یہ کیا بات ہے؟ یعنی الخط نصف الملاقات۔ لیکن ناتوانی کا زور، ضعف کی قوت ایسی بڑھی کہ دست و پا کے حوصلے کھٹ گئے۔ ارادت پادشاہی فوج پست ہوگئی۔ لشکرِ افسوس نے دل کا محاصرہ کیا اور شباشب قلعہ میں در آئے۔ قلب پر شکست پڑی۔ حسرتوں کی صفیں بچھ گئیں۔ ارمان کے پرے کٹ گئے۔ ایسی قیامتِ کبریٰ میں بھلا کیا ہوتا۔ تم کو میری بے دست و پائی کی بخوبی آگہی ہے۔ اگر شکایت علی الرسم مراسلت ہے تو خیر، ورنہ بے جا ہے۔ بلکہ شکایت کی شکایت روا ہے:

وہ بدگماں کہ رہوے نہ طاقتِ جنبش
تو نیم جان، غمِ عشق کو کہیے کارِ حل

تمہارے حال پر اکثر افسوس ہوتا ہے لیکن اب وہ حالت رہی کہ وہ بھی نہ رہا:

"گریہ را ہمدلِ خویش می باید"

تم نے میرٹھ سے چل کر دھولری [18] تک جتنی مسافت طے کی اتنے ہی اس وادی میں ہم سے آگے رہے:

"بڑھ گیا وہ نوجواں، میں پیر پیچھے رہ گیا"

راہ گیروں کو کمان و تیر کا دھوکا ہوا۔ ہم نے تیغ و سناں سے منہ نہ موڑا

آخر بودے نکلے نا:

دھمکی سے دب گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

الطاف حسین ردی کے خط کے ساتھ تمہارا خط میں نے پایا۔ گویا قلندر کے ہاتھ لعل آیا۔ لیکن اس قلندر نے ایسے لعل و جواہر کہیں نہ دیکھے تھے۔ خصوصاً کاغذ میں ٹنکے ہوتے۔ یا یوں سمجھ لو کہ

"مورِ ناتواں کجا ، کاخِ سلیماں کجا"

یہ دیوزاد کی بولیاں ، جنات کی بھاکا ، جانوروں کے چہکارے ، پریوں کے ترانے ، بیچارہ کیا جانے۔ میرے یار نے بے معنی الفاظ نئی گھڑت کے اناپ شناپ درگھسیٹے۔ کیا ہم سمجھتے نہیں ؟ سمجھتے ہیں لیکن الجھتے نہیں۔ بارے میر صاحب موصوف سے کہنا کہ آپ اور ڈھولر کی۔ یہ قدرت نے کیا ان ملی ملائی۔

مرزا نوشہ صاحب مرحوم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ نے مرزا رحیم بیگ کی کتاب کا جواب کیوں نہ لکھا۔ مرزا نے اپنی فطری شوخی سے کہا کہ چاندنی چوک میں مجھ کو ایک گدھے نے لات ماری تو کیا میں بھی اس کے ایک لات ہی رسید کردوں۔ بھئی میر صاحب کی بے معنی کا ہم تو با معنی ہی جواب لکھینگے۔ لیکن انشاء اللہ آل دونوں کا ایک ہوگا:

گویم مشکل دگر نہ گویم مشکل فقط

(تیغِ ہندی۔ ص: ۷۲، ۷۳)

— ۱۱ —

بنام ولایت علی جاود

بعد سلام مسنون۔ تمہارا نامہ آیا۔ دیکھا دکھلایا۔ محمد علی نے پیام دیا۔

ظفر احمد نے سلام دیا۔ پچھلے خط میں میں نے گزارش کیا تھا کہ مولوی حامد حسین صاحب سے میرا پیام کہیے گا۔ بھروسہ دلایا تھا کہ کہوں گا۔ مگر نہ کہا نہ بھیجا۔ مشکل یہ ہے اور بڑی مشکل ہے کہ جو کام ہمارا نہیں کر دیتے، انھیں سے پھر کام پڑتا ہے۔ اکثر اوقات تمہاری نسبت دیر تک غوطے میں رہتا ہوں کہ لکھنو جا کر ان صاحبوں کے قلوب کی قلبِ ماہیت کیوں ہوگئی۔ سفر تو ہم نے بھی بہت کیے ہیں اور اکثر پردیس میں رہے ہیں۔ مگر شاید لکھنو کی تاثیر جدا ہے۔ اس گفتگو سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کے حسنِ محبت میں کلام کرتا ہوں بلکہ حسنِ التفات میں سخن ہے۔ کیوں کہ اثر مرزا ایک بے پرواہ خرام ہے۔ آزادہ گام۔ پابندِ صبح و شام۔ عنایت نام کو نہیں۔ دیکھو تو عنایت علی نام۔ سو وہ بھی پہلے تھا۔ اب تو اثر ہی اثر ہے۔ دبیرؔ کے قطعے میں نے روانہ کیے ہیں۔ خاتمے کا قطعہ۔ خاتمے کا کیا۔ لوگ رسید بھی نہیں دیتے۔

منشی ولایت علی کام یہ ہے اور نیا کام ہے۔ سچ مچ کام ہے۔ آپ کام روا، کامگار، کامدار، کسی کا کام، کسی کا نام۔ اتنی سی بات کو کتنا بڑھایا ہوں۔ اے حضرت ایک لکھنو کی تانبے کی خوبصورت سی لٹیا یعنی لوٹے کی نورچشمی، جس میں ایک آدمی کی پوری پیاس کا پانی آجائے نہایت جلد میرٹھ کو بصیغۂ بیرنگ روانہ کیجیے یا اگر معتبر شخص کوئی اتفاقاً مل جائے تو ارسال فرمائیے۔ ڈالا کچھ ضرورت آدمی کی نہیں ہے بیرنگ ہی روانہ فرمائیے — — — — — باقی تسلیم فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۴، ۵، ۷)

— ۱۲ —

بنام سید مہدی علی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ادرائی

قبلہ و کعبہ ـــــ اپنے بچوں کی اچھل کود دیکھیے ۔ مرتضیٰ مرتضیٰ ۔ ارے اچک ، اچک اور اچک ـــ بھئی ہاتھ نہیں آتا ۔ اب کے ایک اچھالا اور لینا ۔ الا اللہ ۔ ہوں ۔ کوئی نہیں ۔ واللہ بہت اونچا ہے ۔ اب کے اور سہی ۔ ہوں ۔ جانے دو جانے دو ۔ آخر یہ ہے کیا ؟ جی یہ ہمارے قبلہ و کعبہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر کا دامن کرم ہے ۔ اللہ اکبر اس قدر بلند ۔ الحمد للہ رب العالمین ۔ یہ دامن ہے کہ ابر جس کا ہاتھ آنا دشوار ہو رہا ہے ۔ ابر ہے تو ابر کا برسنا شرط ہے ۔ برے کتنے دن گزرے ؟ پورا برس ۔ تو اب برسات میں بارش ہوگی ۔

حضرت ۔ اگر آپ اونچے ہیں تو دامن نیچے رکھیے تاکہ دامن اور ہاتھ کا ساتھ نہ چھوٹے ۔ بذل و احتیاج کا رشتہ نہ ٹوٹے ۔ خاص آپ کے کہنے سے ہم نے " طوطی ہند " بیچ دیا اور بے پر ہو بیٹھے ۔ اب مطبع بے آمدنی ہے ۔ بعد اس کے آپ نے بات بھی نہ پوچھی ۔ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے ۔ آپ نے لکھا تھا مرتضیٰ چپ کیوں ہو ۔ بولے تو یہ بولے ۔ یعنی کہی تو اپنے ڈھب کی ۔ یہ وہ بات ہے ارے بھو کے پانچ اور پانچ کے ؟ جی دس روٹیاں ۔ سوال حسب حیثیت ؟ ع اور یہ نہیں تو ص ، اس سے کوڑی کم نہیں ۔ چہ خوش ۔ مانو نہ مانو مجھ کو مہمان جانو ۔

حضرت شوکت نہیں حضرت شکایت کہتے ہیں کہ قیمت شحنۂ ہند ۲ے چار پہنچی اور عـہ باقی ہیں ۔ ناچار عنایت کیجیے تاکہ چارۂ کار ہو ۔ درد افلاس کا علاج شربت دینار ہے ۔ ہر گھونٹ پر ڈبل دے دیجیے ۔ مگر دیجیے ۔ یا دلا دو علی سے دلا دیجیے ۔ جب ان کی تحریرات تھک رہیں تو اب نوبت بایں جا رسید ۔ القصہ سخی کے دو ہاتھ ہیں دونوں ہی کو یا دونوں ہی کو ۔ فقط (تیغ ہندی ، ص : ۷۹ ، ۸۰)

— ۱۳ —

رکن رکین نقر انجا د حضرت شاد سلامت ! معاملہ معلومہ کے بارے میں لالہ اگر سین
صاحب کے پاس خط بھیجا ہے ۔ یاد کلمتہ الخیر سے دریغ نہ کرنا ۔
بھئی اس کتاب میں تمہارا ذکر دھوم سے ہو گا ۔ اے شاد ! نقش رہ جائے گا،
نقاش مٹ جائیں گے ۔ حروف رہ جائیں گے، حریف اٹھ جائیں گے ۔
اگر ہمارا اخبار دوبارہ نیا نکلے تو تم سہارن پور میں کے پرچوں کی مدد کر سکتے
ہو ۔ فقط (تیغ ہندی : ۸۲)

— ۱۴ —

پیارے جادو
اول تین روپیہ بقایہ ۔ ہم برے، اچھے نہیں ۔ بعافیت ہوں ۔ اور پھر کہو
آگے بھی کیا کیا زخم دل میں پھرٹیس ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ دوبارہ اخبار
جاری کریں ۔ صرف سالانہ اگر تم دس پرچہ لگوا سکو تو زور لگائیں ۔ ورنہ خیر مگر
بغیر پیشگی کیوڑہ ندارد ۔ اس کو بہت بہت دعا اور کہہ دینا :

"سارے مزے زبان کے افسوس گم کیے"

کھانے کا لطف اٹھ گیا ۔ فقط ۔ تحریر تاریخ ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء ۔

(تیغ ہندی : ص : ۸۲)

— ۱۵ —

بنام جی ای وارڈ صاحب بہادر کمشنر میرٹھ

میں ہوں ایک غریب آدمی اس قوم کا جس پر آپ حکومت کرتے ہیں ۔ نیز میں
ہوں ایک حقیر فرد اس خاندان کا جس پر پہلے آپ نے ظلِ پرورش پھیلایا تھا ۔
اور اب بھی آپ کا گوشۂ دامنِ عنایت اس کے اوپر ہے ۔ نیز میں ہوں مالک

ایک چھاپہ خانے کا جس کا نام حدیقۃ العلوم میرٹھ ہے۔ نیز میں ہوں ہندوستان کے ان مصنفوں میں سے جن کی تربیت حکامِ وقت پر فتح مندی کے حقوق سے قرضہ حسنیٰ ہے۔ نیز میرے کانوں میں وہ مژدے لبریز ہیں جو حضور کی قدردانی علم و ہنر سے ہندوستان میں چہار طرف بلند ہیں اور میرے دل میں ٹھہری ہوئی ہیں وہ امیدیں جو دنیا میں نیک نام حکام سے روشن دماغ مصنفوں کو ہوا کرتی ہیں۔ بیشک دنیا کے مصنف مثل ان معدنوں کے ہیں جو زمین میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ حاکم بڑا بلند اقبال ہے جس کے علاقے میں علم کی کانیں نکلتی ہیں۔

اس زمانے میں یہ تاج قدرت نے آپ کے سرِ مبارک پر دھرا ہے اس لیے موتیوں کی طرح ہماری امیدیں اس مبارک تاج میں ٹکی ہیں۔ پس میں چاہتا ہوں کہ علمِ اخلاق میں جو میں نے فارسی نظم میں ایک اعلیٰ درجے کی کتاب لکھی ہے، اس کو آپ کے نام پر ختم کردوں۔ تاکہ جس طرح اور کتابیں حکامِ وقت کے نام پر تصنیف ہوئیں اور ان سے انھوں نے زندگیِ جاوید پائی، حضور کا نامِ نامی بھی دیر تک ہندوستان میں چمکتا رہے اور سورج کی طرح دنیا میں ہمیشہ آپ کے نام کی روشنی قائم رہے۔ فقط (تیغ ہندی: ص: ۸۲)

— ۱۶ —

بنام جی ای وارڈ صاحب کمشنر میرٹھ

کمترین نے ایک قصیدہ معہ درخواست کے حضور میں روانہ کیا تھا لیکن ابھی تک چشم براہ ہوں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اکثر کریم نہاد جس آرزو کو پوری کرنا نہیں چاہتے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کرتے ہیں، کیوں کہ شرم کرم ان کو صاف جواب سے پھیر دیتی ہے لیکن اس میں آرزومندکی

کی مٹی خراب رہتی ہے۔ ہم ایشیائی خیال کے پتلے ہیں۔ ہم جس بلند نام کی مدح کرتے ہیں تو بہت کچھ امیدیں ہمارے دل میں اچھلنے لگتی ہیں۔ کیوں کہ آپ سے پہلے جو لوگ ہم پر حکومت کرتے تھے اور ہم سے پہلے جو لوگ ان کی اطاعت، وہ ان کو دولت لٹا کر زندگی جاوید مول لیتے تھے۔ محمود کا نام نیک فردوسی کی بدولت زندہ رہا۔ ہر حاکم وقت کو چاہیے کہ فرمارویان ماسبق کے رسوم و آثار کو زندہ رکھے۔ خصوصاً ایسی مہذب قوم، آپ جس کے ایک رکن رکین ہیں، کیوں کر اس نیکی سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ اسی امید پر قصیدہ مع اک درخواست کے بھیجا گیا۔ اگر وہ نامنظور اور میں محروم رہا تو جواب سے مطلع فرمایئے تاکہ اضطرار انتظار ختم اور خلش تپش دفع ہو۔ اگرچہ ایسی امید نہیں۔ میں تو یہی سمجھ رہا ہوں کہ دیر آئی درست آئی۔ زیادہ تسلیم و آداب۔ فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۸۵،۸۶)

۱۷

بنام جی ای وارڈ صاحب بہادر

عرض یہ ہے کہ انسان اسی کی تعریف کرتا ہے جس کا اعتقاد اور اخلاص اس کے دل میں کسی طرح سے گھر کر لیتا ہے۔ پس بلند رحمت حکام یا بادشاہ صلہ اس خلوص کا دیتے ہیں، نہ کہ تعریف کا۔ کیوں کہ انسانی دنیا کا کرہ اتحاد و اخلاص کے محور پر گھومتا ہے اور اخلاص کی دقت کے حکام کو سخت ضرورت رہی ہے۔ شاعر گو ایک شخص ہے لیکن وہ اپنی تمام قوم کی گویائی کا ایک پیکر ہے ۔۔۔۔ شاعر کا خلوص ایک قوم کا خلوص ہے میں بار بار آپ کی قوتِ سامعہ کو کھٹکھٹاتا ہوں۔ اس کا قضیہ یہ ہے کہ

کوئی حاجت مند جب کسی دروازے پر آواز دیتا ہے، اگر اس گھر میں کوئی ہے اور وہ جواب نہیں دیتا تو وہ اس وقت تک پکارنے سے باز نہیں رہتا جب تک جواب نہیں پا لیتا۔ کیوں کہ اکثر ضرورتیں انسان کے ارادوں میں توقف ڈال دیتی ہیں۔ ہاں پکار دینے والے کو اگر یہ اطلاع دلائی جاتی ہے کہ یہ گھر اجاڑ ہے تو وہ ایک آواز دے کر ہٹ جاتا ہے۔ پس جیسے مبارک مکان میں ایسا کریم رہتا ہو، حاجتمند اس کے در سے دور نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ جواب نہ سن لے۔ بلکہ جوں جوں دیر ہوتی ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ صاحبِ خانہ میری احتیاج کا سامان کرتا ہوگا۔ پس امید ہے کہ یہ تیسری آواز واپس نہ آئے گی۔ اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ اگر پچھلی درخواست نامنظور رہے تو ایک اور سہل درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یکم جنوری ۸۵ء سے میں ایک رسالہ شائع کروں گا جس کا نام "وارڈنامہ" ہوگا۔ اس میں کل علمی مضامین نظم ہوں گے۔ اخلاقی اور پولیٹیکل وسوشل مضامین بھی نظم میں لکھے جائیں گے۔ لیکن یہ نظم ایشیائی نمونے پر نہ ہوگی جو تکلفات اور مبالغے سے اور جھوٹی باتوں سے بالکل بھری ہوتی ہے بلکہ انسان کے سچ خیال کی تصویر ہوگی۔ اس کی تصنیف کا موجد فقیر اور اس کی ستجوع کی، موجد اور میرے حضور ہوں گے۔ اگر آپ اپنے ماتحتوں میں دو سو پرچے اس رسالے کے، بقیمت پیشگی نشر کر دو گے، جو حضور کے ایک ادنیٰ اشارے سے باآسانی ممکن ہے تو یہ مبارک علمی یادگار دیر تک ہندوستان کی آنکھوں میں چمکتی رہے گی۔ البتہ کام شروع کرنے کے لیے حضور کو جیب خاص سے بطور پرورش فقط پچاس روپے مرحمت فرمانے ہوں گے اگر حضور اس تجویز کو منظور فرما دیں تو یکم جنوری ۸۵ء سے پہلے مجھ کو اس کے بابت اطلاع اور اطمینان ہونا چاہیے۔ اس پرچے کی قیمت فقط عصہ

ہوئی جو کسی پر گراں نہیں اور ہر مہینے میں ایک کتاب بن کر شائع ہوگا۔ فقط امیدوارِ جواب۔ سید محمد مرتضیٰ بیان ویزدانی، مالک مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ (تیغ ہندی۔ ص: ۸۶، ۸۷)

— ۱۸ —

بنام مولوی محمد اسحٰق

شوخیاں اتنی کہاں چرخ کی عیاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

وہ معشوق آپ نہ ہوں:

"آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں"

افسوس آپ نے سلسلۂ خط و کتابت القط کر دیا۔ ہم نے تو معترض صاحب کو ابھی ابتدا ہی شروع سمجھے تھے کہ کوئی روز کی دل لگی ہاتھ آگئی۔ مگر کوئی ایسا بیچ پڑا کہ معترض ہتے ہی سے ٹوٹ گیا۔ چوں کہ اصل ابھی دور تھا۔ امید تھی کہ سلسلہ بڑھے تو معترض کو چودہ طبق روشن ہوں کہ اہلِ کمال پر اعتراض کر بیٹھنا کوئی لڑکوں کا کھیل نہیں۔ لیکن دفتر گاؤخورد ہو گیا۔ اب تک انتظار رہا۔ آج خیال آگیا کہ مبادا معترض نے یہ جان کے طرح دی ہو کہ طول سے یزدانی طول ہوا اور چشمِ بصیرت سے پردۂ غفلت نہ اٹھایا ہو۔ اس لئے ضرور ہوا کہ حقیقت کھول دی جائے تاکہ معترض کو پوری ندامت ہو اور آئندہ احتیاط ملحوظ رہے۔

اب سنئے۔ غدر سے پہلے دہلی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ تھا۔ صہبائی اور آزردہ وغیرہ شعر کے اساتذہ جمع تھے۔ مرزا نوشہ غالب نے ایک فارسی غزل پڑھی، جس کا ایک مصرع یہ تھا:

"بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتہ است"

صہبائی نے ابھر کر کہا کہ "عصا خفتن" میں کلام ہے۔ غالب بولے کہ دیکھیے۔ مجھ ہندی نژاد کا عصا پکڑ لیا، اس شیرازی کا عصا نہ پکڑ لیا۔

"ولے بجملۂ اول عصائے شیخ بخفت" سعدی

اس طرح بیچارہ یزدانی ناکردہ گناہ ہے۔ رقعۂ زریں کے عنوان پر جو شعر لکھا گیا تھا کہ

بہار شد کہ چمن جام ارغواں گیرد
زجوش سبزہ زمیں رنگ آسماں گیرد

معترض نے یزدانی کا غریب شعر سمجھ کر جھٹ اعتراض ٹانک دیا۔ مزہ یہ ہے کہ "بہار شد" تو درکنار، مرزا صائب نے "بہار گشت" بھی باندھا ہے۔ پھر کہیے اعتراض چہ شد اور معترض چہ گشت۔ اشعارِ ذیل عینکِ انصاف لگا کر پڑھیے:

بہار شد کہ چمن جام ارغواں گیرد
زجوشِ سبزہ زمیں رنگِ آسماں گیرد — شیخ علی حزیں

بہار گشت چمن چتر بادشاہی زد
خوشم کہ شاہدِ گل عطرائے گواہی زد — میر معصوم ایرانی

افسوس ہے کہ کوئی اور چھپائی آپ نے مطبع کو عنایت نہیں کی ابوالمظفر خان سے کہنا کہ "دیوان کلیاں" تو سبز باغ تھا۔ بھلا ہم کسی کے فقرے میں آتے ہیں۔ البتہ ایک پردف کا ٹوٹا رہا۔ فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۸۸، ۹۰)

— ۱۹ —

بنام سید سلطان الحق

عزیز از جاں نگار سید سلطان الحق سررشتہ دار

دیر آید درست آید

تارے ٹوٹے اور پنچ لوٹے۔ منا صفہ ناچار، میاں مجبور و مختار۔ خدا برکت دے اور بہت دے۔ ہجوم کار و افکار معلوم، فرصت معدوم۔ حدِ اعتدال تو ہے تھی۔ عہ برائے عالم بالا اور ہے میں مخلوقاتِ سفلی۔ انتہا دس عہ۔ اس سے زیادہ نکل چلنا شکنجے سے نچوڑنا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ سبزۂ بیگانہ تراشا جائے۔

السعی منی والاتمام من اللہ

تم کیا کہو گے۔ تمہاری حالت خود اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے دل دکھتا ہے۔ یعسوب الدین کا افسوس ہے۔ قسمت سوتی ہے اور کاہلی پاؤں دباتی ہے۔ بیماری چادر اڑھاتی ہے۔ ہم بہتیرا جلاتے ہیں۔ آنکھ نہیں کھولتے۔

"کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگتے حشر تک نہیں ہیں"

حکیم کو تسلیم۔ کتاب میں نہیں بھیج سکتا۔ تقریظ حسین بھی۔ یہ تالی ایک ہاتھ سے نہ بجے گی۔ ابوالحسن تیس مار خان ہو گئے۔ (تیغِ ہندی، ص: ۹۱)

— ۲۰ —

بنام مولوی ظفر احمد

جاں کو مری کیا سپند، مجمرِ اشتیاق پر

دل کو مرے کیا بخور، آتشِ افتراق بر
ہائے عنائے زندگی، اس پہ بلائے ہجر بھی
آگ لگی حیات کو، خاک پڑی فراق پر

مولوی ظفر احمد تا عاقبت، باعافیت۔

وہی ہجراں کی بیماری جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
وہی ماتم، وہی زاری، جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
رواں ہے خاک اب ریگِ بیاباں کیطرح ہے ہے
وہ جاناں کی طلبگاری جو آگے تھی، سو اب بھی ہے
بہے لختِ جگر جوں تختہ ہائے کشتیِ طوفاں
وہ دل سے سیل خوں جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
موئے رگ ہائے گردن میں ابھی اک شور ہے شاید
ترے خنجر میں خوں خواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
کبھی تپ لرزہ حاصل ہے، کبھی درجع مفاصل ہے
غرض اک آدبیماری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
بیاں اس بوجھ میں گر دب کے رہ جائے عجب کیا ہے
کہ اس پہ زندگی بھاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

صفدر خان کا کچھ پتا معلوم ہو تو لکھو، میرے پاس سے ان کا خط کھو گیا ہے۔ اس سے پچھلے خط میں تم نے میری شکایت کی حکایت لکھی تھی کہ پورا ایک مہینہ ہوا تم نے ہمارے خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ ہم نے جو خط تمہارے پاس ۲ جولائی کو بھیجا تھا اس کا جواب بیس روز بعد لکھا۔ اگر یہ کہو کہ میں نے سبب بھی لکھے تھے تو بس یہی سمجھ لو یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی ایسا ہی سببِ عارض

ہو جاتا ہے کہ وہ جواب میں دیر لگاتا ہے۔ چنانچہ اس خط کے جواب میں مجھ کو قریب ایک مہینے کے توقف ہوا۔ اب سبب بصد عجب بے تعب گوش طلب آویزہ گوش کیجئے۔ جب تمہارا خط آیا تھا میں تپ ولرزہ میں مبتلا تھا اور اس بلا کا تپ ولرزہ تھا گویا زمین کو بہنچا آیا تھا۔ کئی دن بے ہوش رہا۔ بعض کو حیات میں تردد رہا اور مجھ کو تو اب بھی ،، اگرانی تہ ہے۔ دو مسہل ہوتے۔ کونین کا اور گلوہ کا استعمال رہا۔ بارے پہلے سے کچھ تخفیف ہے۔ مگر وجع مفاصل اور تبخیر صعود حرارت بعد غذا بجزبی ہوتی ہے کہ یہ بھی بخار سے کم نہیں ہے۔ ہر روز منتظر رہتا تھا کہ اگر آنکھ کھلے تو تمہارے خط کا جواب لکھوں۔ پھر برسات اس غضب کی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ فرزندان نوح طوفان میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ادنیٰ پانی کی طغیانی کی کیفیت یہ تھی کہ سڑک پر کشتی چلی۔ کچہری تین دن بند رہی۔ فقط (تیغ ہندی۔ ص: ۹۲، ۹۴)

—— ۲۱ ——

بنام منشی ممتاز علی خان

راہ رسمیست دوستاں را ترا
کہ بیاد آورند یاراں را

منشی اٹھیے ممتاز علی صاحب آگے بڑھیے۔ سر دست پر بوسہ دوں۔ اپنا نقش قدم بتائیے کہ سجدہ کروں۔ ہاں مگر وہ نازمیں پھر بھی بھلا پاؤں کہاں کھتے ہیں۔ یہ سب امور یعنی ہوس دست بوسی وسجدہ ریزی آپ کی یاد کرنے کے ادائے شکر میں ہیں۔ استغفر اللہ یہ شکر کب ادا ہو سکتا ہے:

از دست وزبانی کہ بر آید
کز عہدہ شکرش بدر آید

غرض یہ کہ مجھ جیسے دور افتادہ، سرِ جان بیادہ دادہ کو کون پوچھتا ہے کہ میرا ہی شعر ہے:

سنتا نہیں ہے کوئی بھی فریاد کو مری
یارب جنوں نے پھینک دیا ہے کدھر مجھے

اس وجہ سے تم نے جو یاد کیا مجھ پر ایسا احسان ہوا جیسا سر کے اتارے کا ہوتا ہے۔ بھئی یعقوب علی وعلیکم السلام۔ آپ کا سلام پہنچا۔

سلامے چوں دمِ عیسیٰ معطر
سلامے چوں کفِ موسیٰ منور

آپ بھی یہیں ہیں۔ ہم کو نہ معلوم تھا۔ جہاں رہو، خوش رہو۔ فقط
(تیغِ ہندی۔ ص: ۹۸، ۹۹)

— ۲۲ —

بنام مولوی ظفر احمد

کیا کم ہے یہ خوشی کہ ظفر کا رفیق ہوں
مانا کہ عیش و عشرت و فرحت نہیں مجھے

آنکھ پُر انتظار، دل بیمار، بدن زار، طبع کو آزار:

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اے لوگو! وفا کیوں بھلائی۔ بھلائی سے کیوں بل آیا۔ جفا کیوں پسند آئی۔ برائی سے کیوں جی لگایا۔ مروّت کیوں چھوڑ دی۔ محبت کیوں توڑ دی۔ اگرچہ میں وہ نہیں رہا، تم تو وہی ہو۔ اگر میں نے اپنی بات میں تزلزل پایا، تو پایا، تمہاری بات میں کیوں فرق آیا۔ اگر میں بے نصیب ہو گیا، تم تو خوش نصیب رہے۔ اگر میں ذلیل ہو گیا، تم تو ہنوز عزیز ہو، صاحبِ

تمیز ہو۔ اگر مجھ میں علالت سے حالت نہیں، تمہاری حالت کہاں گئی، باوجودیکہ علالت نہیں۔ اگر ہمارا حال رذی ہے، تمہاری نیت میں کیوں بدی ہے۔ ہم بے دست و پا ہو کر چل نہیں سکتے کہ تم تک جاتے، تم ہاتھ پیر والے ایسے نکلے کہ ہم تک نہیں آتے۔

باد فنا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد — نقطہ

(تیغِ ہندی۔ ص: ۱۰۲، ۱۰۳)

—— ۲۴ ——

باز آئیں بھی مگر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

حضرت بے ریا۔ ذکر باسلامت

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یاد ہوتا تو حقوقِ آشنائی فراموش نہ کرتے۔ یہاں کرار حسن دانی بزبانی کہاں۔ افسوس لذتِ عشق کیا ہوئی۔ ہم پاس بھی دل، زبان، ہاتھ تھا، جھٹ گر جاتے اگر آتے۔

جگر کو مرے عشق خونابہ شد کہ
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت کہ

نزدیک رہ کر بھی نہ ملے۔

اشکِ غم ہم نفسِ جان سے کھوتے ہیں مجھے
کیا کروں کیا مرے ہم چشم ڈبوتے ہیں مجھے

اس پر طرہ یہ کہ "اودھ پنچ" کے مزخرفات چھاتی سے لگاتے پھرتے ہو اور ہمارا کلام سوت کے بچہ کی طرح پسِ دیوار رکھ دیتے ہو۔ حق ہم وطنی خوب ادا کیا۔

پھر یہ کیا منصفی ہے۔ یک طرفہ ذاکر ہوں۔ حسرت آتی ہے کہ آج آپ جائیں گے اور ہم دیکھتے رہ جائیں گے۔

نکلتی کس طرح ہے جاں فقط یہ دیکھتے جانا
ہمارے پاس سے جانا تو مڑ کر دیکھتے جانا

ایسا آنکھ پر ہاتھ رکھ لینا تمہاری سنگدلی ہی ہو سکتا ہے۔ ایک بیمار ردد ست ناتوانی کے پھندے میں پھنسا ہوا، پادر رکاب خود ہو، اس کے پاس سے نکل جائے اور اس کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے تو تف اس شکوہ و دولتِ دنیا کے نام پر۔ فقط (تیغ ہندی۔ ص: ۱۱۰)

—— ۲۴ ——

بنام محمد حامد حسین

۔۔۔۔۔۔۔۔ خواصِ خمسہ اور جرعۂ جام یہ دونوں رسالے میرے دردِ دل کے کارنامے تھے بلکہ مرضِ محبت کا ہذیان تھا۔ جرعہ یار لوگ اڑا گئے۔ خواصِ خمسہ دوستوں اور خریداروں کے ہاتھوں پریشان ہو گئے۔ خاص میرے پاس بھی نہیں ہے اور بعد تلاش معلوم ہوا کہ بازار بھی اس یوسف سے خالی ہے۔ لیکن اگر مل گیا تو فوراً بھیج دوں گا۔ اگر زیادہ شوق ہو تو کچھ کلام خوش نویس سے نقل کرا کر بھیج دوں۔ والد آپ کے کس طرح ہیں۔ افسوس کہ ہنر بے دولت ترقی نہیں کرتا۔ اہلِ ہنر بے دولت ہیں۔ اور اہلِ دولت بے ہنر۔ فی الحال ایک مثنوی "جریدۂ آفتاب" توحید کے باب میں میں نے لکھی ہے۔ کل عہ میں وہ چھپ سکتی ہے۔ مگر اخراجاتِ ضروری سے نہ چھپنا محال۔ روپیہ کہاں۔ فقط

(تیغ ہندی۔ ص: ۱۱۱)

طرازِ دامنِ گلچیں نگار، آستینِ سخن رنگیں دوستدارِ حضرت امیر سلمہٗ ۲۲؎ ۔ القدیر حکمائے اواخر کتبِ حکمت اخلاق، مختلف دیار و امصار کی آب و ہوا کے ساتھ مختلف اقسام کے خواص و ذاتیات کا بھی بطور انموذج ذکر کیا ہے ۔ لیکن عالم استقرار کی کہنہ سیاح یعنی میری نگاہ نے اہلِ پورب سے یعنی بقاعِ شرقیہ ہند جس میں اہل لکھنو بھی کلادہ ہیں کہیں بے وفائی کا ذکر نہیں دیکھا ۔ خدا مجھ کو اگر وقت دے گا تو میں کتبِ حکما کے اواخر میں ان کی بے وفائی کا ضمیمہ ضرور لگا دوں گا ۔

" جب طوطیِ ہند " ہمارے ہاتھ پر بولتا تھا تو اہلِ پورب ہم صفیر تھے ۔ اب کوئی نہیں پوچھتا کہ کس گھر بولتے ہو ۔ گورکھپوری میناؤں کو تو گوبانگے لے گئے ۲۳؎ لکھنو میں تو بلبل کا شور تھا معلوم نہیں کہ کیوں بند ہو گیا ۔ نہ پیاسے نہ سلائے ۔ اب اس اوجِ سخن کے شاہبازِ آب دامنِ گل چیں نے ہندوستاں سے گلباری شروع کی اور کوئی پھول ہم پر نہ پھینکا ۔ ہر چند ہم زبانِ خموش سے کہتے رہے کہ :

" اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی "

لیکن

" گرا جو برگ شجر پائمال رہتا ہے "

کون پوچھتا ہے ؟ خیر کفِ گلچیں مرے گل کے گریباں تک نہیں آیا کہ ضرورت نہ تھی کہ سینہ پر داغ آتے ہوئے دامنِ گلچیں کی ہوا کھاتے .....

لیکن چوں کہ دامنِ گلچیں کے بار احسان تھی ، دو پھول دو روپیہ قیمت کے برابر اترتے تو آپ کی یادآوری سے محبت کا چلن کھرا ہو جاتا ..... فقط

(تیغ ہندی ۔ ص : ۱۱۲ ، ۱۱۳)

— ۲۶ —

پشت و پناہِ اسلام و اسلامیاں دامت برکاتہم

افسوس خونِ جگر، غمِ بے اختیاری سے خشک ہوگیا ورنہ یہ عریضہ میں اپنے خونِ جگر سے ہی لکھتا۔ آپ کا عروجِ ہمت اور اس کا آوازہ بلندیں سن چکا ہوں آپ کے دل میں ہمدردی ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مروت گوشہ گیر ہے۔ فیاضی آپ کی دست بوسی کو اپنا شرف سمجھے ہوتے ہے ۔۔۔۔۔

کیا عجب ہے کہ آپ مجھے کسی نہ کسی تقریب سے جانتے ہوں گے۔ میں ایک سوگ نشیں ہوں کہ اپنے معنوی بیٹوں کے ماتم میں خاک اڑاتا ہوں اور نگاہِ مایوس سے چار طرف دیکھتا ہوں کہ کوئی علوئے ہمت، جواں مرد، جس کے دل میں روح القدس نے دم پھونکا ہو آئے اور مری گود میں جو میرے بچوں کی لاشیں دھری ہیں، ان میں ایک جنبشِ لب سے جان ڈال دے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ متین زندہ ہوکر اپنے جلانے والے کا قیامت تک دم بھرتے رہیں گے۔ آپ کا نادیدہ، خاکِ راہ سید محمد مرتضٰی بیان دیزداں، مالک مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ (تیغ ہندی۔ ص: ۱۱۸)

بیان کے جو چھبیس (۲۶) خطوط "تیغ ہندی" سے منتخب کرکے نقل کیے گئے ہیں، ان کے انتخاب میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ بیان کی مکتوب نگاری کی تمام خصوصیات سامنے آجائیں۔ اگر ڈاکٹر جانسن کا یہ خیال صحیح ہے کہ ـــــ "انسان کی روح اس کے خطوط سے عریاں ہوتی ہے۔ اس کے آئینے میں ہم انسان کی نفسیات کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے ہماری بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں اور بہت سے

دھندلے نقوش ہمیں نظر آتے ہیں " ـــــ تو پھر ان خطوط کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بیان کی فکر و نظر پر غالب کی گہری چھاپ تھی اور وہ ان کو اپنا معنوی استاد سمجھتے تھے ۔

بیان کی مکتوب نگاری کا آغاز عود ہندی کی اشاعت (۱۸۶۸ء) کے فوراً بعد ۱۸۷۰ء کے آس پاس ہوا ۔ ابھی یہ طرز اور اسلوب مقبول بھی نہیں ہوا تھا کہ بیان نے اسے اپنایا اور اس کی کامیاب تقلید کی ۔ اس طرح بیان پہلے غالب پرست اور غالب شناس کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔ انھوں نے غالب کی طرح اپنے دوستوں ، شاگردوں اور رشتے داروں سے خطوط نہ بھیجنے کی شکایت کی ۔ اپنے دلی جذبات و احساسات کو قلمبند کیا ، علمی بحث کی ۔ طویل القاب و آداب کو چھوڑ کر اپنے مطلب کی باتیں کہیں ۔ سلیس ، سادہ اور عام فہم زبان میں خطوط لکھے اور مکالماتی اندازِ تحریر سے اس کو جاندار اور پر اثر بنایا ۔ ان خطوط سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے ۔ یہ غالب پرستی اور مکتوب نگاری کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

حل المطالب (شرح دیوانِ غالب) :

بیان کی حل المطالب (شرح دیوانِ غالب) ان کی غالب پرستی کی سب سے اہم شہادت ہے ۔ انھوں نے یہ شرح ۱۸۹۵ء میں ایک خاص جذبے اور مقصد کے تحت تفصیل سے لکھنا شروع کی ۔ ہوا یہ کہ ان کے ایک ہم وطن سید احمد حسن شوکت میرٹھی (و : ۱۸۳۹ء ، ف : ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء) نے اپنے پرچے شحنۂ ہند میں دسمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے سے " حل کلیاتِ اردو مرزا غالب دہلوی " کے عنوان سے غالب کے کلام کی شرح کا سلسلہ شروع کیا ، جس میں انھوں نے غالب کے کلام میں تحریف و تصرف کیا اور بعض اشعار

کے سات سات معنی بتاکر خوب دادِ تحقیق دی ۔ یہ کمل شرح شوکت المطابع میرٹھ سے ۱۵۰ صفحات پر اکتوبر ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی لیکن اس کو اس عہد کے علمی وادبی ماحول میں شرح کا درجہ نہیں دیا گیا اور اس پر کافی انگشت نمائی ہوئی ۔ شوکت کی اسی شرح کے جواب میں بیان نے اپنے پرچے ماہنامہ لسان الملک کے دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے حل المطالب کے عنوان سے دیوانِ غالب کی شرح کا سلسلہ شروع کیا ۔ انھوں نے شرح کی ابتدا سے پہلے جو پیش لفظ تحریر کیا ہے اس میں اس حقیقت کے متعلق ہلکا سا اشارہ ملتا ہے ۔ وہ غالب کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنے انداز میں لکھتے ہیں :

> "حق تو یہ ہے کہ مرزائے مرحوم اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے ۔ ہندوستان میں مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد ایسا نازک خیال کوئی پیدا نہیں ہوا ۔ انھوں نے اردو غزل کو شہوانی لذات کا کھلونا نہیں بنایا ، بلکہ عشق و عاشقی کے مضامین کو حکیمانہ پوشاک پہنا کر اربابِ نظر کے سامنے صدرِ مجلسِ فصاحت پر لا بٹھایا ۔ دلی کی زبان ، پھر اس میں تازہ معنی کی جان ، اس پر کرشمہ ہائے حسنِ بیان :
>
> اے تو مجموعۂ خوبی زکدامت گویم
>
> البتہ مضامین میں ان کے باریک خیالات نے شاہدوں کے گھنگر والے بالوں کی طرح ایک الجھاؤ پیدا کیا ، لیکن وہ زلفوں کی الجھن ، معشوقۂ تقریر کا حسن و جمال ، ترکان کا شوخ اور خوبانِ چرکسی کے عارضِ پرنور کی طرح اور بڑھاتی رہی ۔ البتہ ہر کس و ناکس کی یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنی انگلیوں سے

مضامین باریک کی گتھیاں کھول سکے، بلکہ اچھے اچھے
موشگاف عاجز آ گئے۔

دریں ولا ایک مدت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلاتِ کلامِ غالب
کی دھوم مچی ہے اور بیشتر مفردرین اور متحصّلین اشعار
کے معنی پوچھتے پھرتے ہیں۔ خود ہم کو اپنے عزیز وقت
صرف کرنے کا اکثر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نیز اہلِ دعویٰ
کے بتلائے ہوئے معانیِ غیر واقع کا تذکرہ بھی ہم تک
پہنچا ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ ہم لسان الملک
میں تھوڑی سی جگہ بقدرِ امکان مصلحت شرحِ اشعارِ
غالب کی نذر کیا کریں تا کہ اہلِ شوق اور ہم دونوں وقت
سے چھوٹیں اور کاغذ کی روشن تحریر ہمیشہ کے لیے جستجو کو
مشکلات کی تاریکی میں چراغِ ہدایت دکھاتی رہے:

سرمایۂ ما جملہ نصیبِ دگرانست
چوں غرّہ شوال کہ عیدِ رمضانست

جہاں تک کلامِ غالب کی شرح کاری کا تعلق ہے، غالب بذاتِ خود
اپنے کلام کے پہلے شارح ہیں۔ انھوں نے اپنے چند خطوط میں بعض اشعار
کے معنی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے کلام
غالب کی تشریح و توضیح کی۔ اس لحاظ سے خواجہ قمرالدین راقم (۱۸۳۲ء۔
۱۹۱۰ء) کی شرح، حلم شاگرد درگا پرشاد نادر دہلوی کی سہ چمن (؟)
اور مولانا الطاف حسین حالی کی یادگارِ غالب (مطبوعہ ۱۸۹۷ء) قابلِ ذکر
ہیں۔ راقم کی شرح نایاب ہو چکی ہے اس لیے اس کی تفصیلات نہیں
ملتیں۔ حالی نے کوئی باضابطہ شرح نہیں لکھی ہے بلکہ ضمنی طور پر چند

شعروں کا مفہوم بیان کیا ہے۔ اسی طرح حلم شاگرد نادر دہلوی نے ۴۰ اشعار کی شرح لکھی ہے جس کا تعارف نثار احمد فاروقی نے سہوانگا در دہلوی کے نام سے ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کے غالب نمبر میں کرایا ہے۔

ناقدینِ ادب اس امر میں متفق ہیں کہ دیوانِ غالب کی سب سے پہلی باضابطہ شرح مولانا عبدالعلی والہ حیدر آبادی کی "وثوق صراحت" ہے، جو ۱۸۹۶ء میں مطبع فخرِ نظامی حیدر آباد سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی بقول مولانا حسرت موہانی صرف مفید اشاروں کا مجموعہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد شوکت میرٹھی کی شرح حلِ کلیاتِ اردو مرزا غالب دہلوی ۱۸۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی جو تحریف و تصرف سے بھری ہوئی ہے۔ اگر بیان کی شرح مکمل ہوجاتی تو دیوانِ غالب کی سب سے پہلی باضابطہ اور عالمانہ شرح ہوتی لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ ۱۳ غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا، ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء کو بیان کا انتقال ہوگیا اور یوں دیوانِ غالب ایک قابلِ قدر، عالمانہ شرح سے محروم رہ گیا۔ اگر یہ کام مکمل ہوجاتا تو شاید اس اعتبار سے نقشِ اوّل ہوتا۔

آج تک شرح کی ان اقساط کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اسی لیے اسے لسان الملک کے پرچوں سے یک جا کرکے شائقین ادب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ افسوس کہ تلاشِ بسیار کے باوجود تین شمارے حاصل نہ ہوسکے، جن میں مندرجہ ذیل اشعار کی شرح تھی:

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا (غزل ۶، شعر ۲)

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

(غزل ۱۰، شعر ۳، ۴)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی ہوں
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(غزل ۱۲، شعر ۱)

یہاں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضرور ہے۔ بیان نے جن اشعار کو لے کر شرح کی ہے ان میں سے چند ایسے ہیں جن میں دیوانِ غالب (مرتبہ مالک رام) اور اس دور کے مستند نسخوں کے بالمقابل لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیکھیے:

حل المطالب	دیوانِ غالب (مرتبہ مالک رام)
تھا خواب میں خیال کو مجھ سے معاملہ	تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا	جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا	درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہ تھی	دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا	آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
ہے نو آموزِ فنا ہمت دشوار پسند	ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا	سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا	تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا	اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی	جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا	دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ تن کی ہے	یہ لاش بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا	حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے سے بھی راضی کہ کبھی	ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا	گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

اب شرح ملاحظہ کیجیے۔ ۱۹۲۴ء

۱

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

حضرت کا دیوان وہ تنک مزاج معشوق ہے، جس کی چوٹی کا پھول یہ ہے۔ نغمہ سنج بلبلیں اس پر چہچہے کرتی ہیں اور کسی کی آواز گلدستۂ قبول تک نہیں پہنچتی۔ اب کے کلک مشق پسند کا نقش نہیں، کرسی پر ایک نازک مزاج بادشاہ کمالِ کبر و نخوت سے گوشۂ ابرو کج کیے ہوئے، تاجِ مرصع ترچھا رکھے ہوئے، ناز و تمکیں کے ساتھ خاموش بیٹھا ہے:

اے عندلیبِ نالاں! دم در گلو بگیری
گوشِ گل است نازک، تابِ سخن ندارد

دیوان کا دیباچہ ہے، حمد الٰہی کا بیان ہے اور نقاشِ قدرت کی کمالِ صنعت گری کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں تصویر بول اٹھی۔ مصور کی معجز نگاری یہی ہے کہ نقش کا حسن خود اس کی شہادت ادا کرے چہ جائیکہ نوبت بفریاد پہنچے۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"

معشوق کو ستمگر کہتے ہیں۔ ستم کا مآل عاشقانِ دل دادہ کی فریاد خوانی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ شوخیٔ تحریر نے ذاتِ نقش پر وہ ستم کیا ہے کہ وہ باوجود خاموشی، فریاد کرتا ہے اور اس کی کیا دلیل ہے ؟ دلیل یہ ہے کہ :

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

مرزا صاحب فارسی نژاد سلجوقی ترک تھے۔ فارسی محاورات دل میں بسے ہوئے ہیں، وہی لب سے ٹپکتے ہیں۔

ایران کا دستور تھا کہ فریادی لوگ کاغذ کا لباس پہن کر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے تاکہ کمال مظلومیت کا کاغذی ثبوت دیں۔ اس لیے جو تصویریں کاغذ پر کھینچی جاتی ہیں اور قلم کی نقاشی سے صورت پذیر ہوتی ہیں، ان کا کاغذی پیرہن ہونا ظاہر ہے۔

غالب کہتے ہیں مصورِ حقیقی کی تعریف کسی دوسرے کیا ہو سکتی ہے، خود نقش اس کی ثنا بلکہ اس کے حسن و خوبی سے بے چین ہو کر فریاد کرتا ہے۔ بس اس سے بڑھ کر نقاش کی کمالِ صنعت کیا ہو سکتی ہے اور حمد میں اس سے افزوں شاعر کیا کہہ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ :

صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ

آیۂ قرآنی ہے۔ یعنی صورت بنائی تمہاری، سو کیا اچھی صورتیں تمہاری۔ مرزا صاحب کا غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

مرزا صاحب کو ذاتِ معشوق کا اپنی طرف کھینچ لینا منظور ہے لیکن وہ :

"کھینچتے ہیں جس قدر اتنا ہی کھینچا جائے ہے"

اجتماعِ ضدین ہو تو کیوں کر ہو، اس لیے حضرت بھولے بھالے معشوق کو ڈانٹ بتاتے ہیں اور بڑی کڑی دھمکی دیتے ہیں کہ ہمارا جذبِ دل اپنی والیوں پر آگیا تو :

"کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے"

یہ دور از کار فقرے سن کر وہ شوخ مزاج مسکرا دیا۔ آپ ٹھہرے سلجوقی ترک، چٹ بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے :

"جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے"

یعنی آپ کی کیا حقیقت ہے۔ دل کی کشش وہ چلتی پون ہے کہ جمادات پر اثر کرے۔ کسی شائقِ شہادت نے ذرا زور دیا تھا، اس پر تلوار اپنی طرف کھینچ لی۔ پھر کیا تھا جذبِ صادق اور سچا عاشق، بیچارے کا دم سینے سے باہر نکل آیا۔ شمشیر کے اندرونی حصے کو سینہ فرض کیا ہے اور بیرونی جرم کو دم جسے دھار کہتے ہیں۔

یا : شاعر کا عام خطاب ہے کہ شوق کے جذبۂ بے اختیار کا ایسا پُر زور اثر ہے کہ وہ سنگ و آہن میں تاثیر کرتا ہے۔ چنانچہ سچے عاشق کی طلب شہادت سے خلافِ عادت یہ امر ظاہر ہوا کہ وہ تلوار تک نہ پہنچ سکا، تو کششِ شوق، دم شمشیر کو سینۂ شمشیر سے باہر کھینچ لائی۔ یہی مقصود شائقِ شہادت تھا۔ پس نہ چاہیے کہ کوئی معشوق عشاق سے گردن کشی کرے اور طالب وصال سے دور رہ کھنچے۔

ماحصل : عشق بازوں میں کرامات نہ ہو، کیا معنی
جس کو دل چاہے، ملاقات نہ ہو، کیا معنی

کاؤ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

کاؤ کاوِ = کھودنا، کریدنا، کدوکاوش کرنا،

سخت جانی = مشکل سے مرنے کو کہتے ہیں۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ شام فراق کی کٹھن تنہائی کا تردّد اور اس کی کاوشیں کیا پوچھتا ہے! نہ پوچھ، اس لیے کہ احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ اس رات کی تنہائی ایک مار ڈالنے والی چیز ہے۔ لیکن عاشق بیچارہ مرجاتا تو اس کالی بلا سے پیچھا چھوٹتا۔ یہ تو وہ مشکل ہے کہ پانچ سو برس قید رکھوں اور مرنے نہ دوں۔ وہ سخت جاں جس کو ایسی مصیبتوں میں موت نہیں، شام جدائی کو اگر صبح تک لے جائے یعنی رات گزر جائے اور صبح نظر آئے تو گویا اس نے ایسی جانفشانیاں کیں اور ایسی محنتیں اٹھائیں، جو پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے میں عائد حال ہوتی ہیں اس میں لطفِ سخن یہ ہے کہ کالی رات کو پہاڑ سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ مراد بھی اس سے پیدا ہوسکتی ہے کہ فرہاد جوئے شیر پورے طور سے نہ لا سکا اور اس نے اثناءِ راہ میں جان دے دی۔ اسی طرح سے مسلسل شامِ فراق کا صبح تک پہنچنا برائے نام ہے اور بس۔

ماحصل: شامِ فرقت کس بلا کی رات ہے
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آگہی = جاننا، علم حاصل کرنا ● شنیدن = سننا ● دام = جال ● مدعا = مطلب

عنقا = ایک جانور کا نام ہے۔ بعض اگلے محقق کہتے ہیں کہ دیارِ مغرب میں یہ جانور
پرانے سیاحوں کی نظر سے گزرا ہے۔ بعض کہتے ہیں، نہیں فرضی اسم
ہے۔ عنق عربی میں گردن کو کہتے ہیں۔ قدیم تحقیقات نے اس کو لمبی گردن
کا جانور سمجھا ہے، اس لیے عنق سے منسوب کیا اور عنقا نام رکھ دیا۔ جدید
محقق اس گمنام طائر کو چین کے جنگلوں میں ثابت کرتے ہیں۔ اور ہُما بھی
جو مشہور ایشیائی فرخندہ فال پرندہ ہے، اسی کو کہتے ہیں۔ بہر حال
فارسی اردو کے محاورات میں کمیاب شئی پر اس نام کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

جیسے :

"عنقا شکارِ کس نشود دام باز چیں" حافظ

"عنقا تھا نام جانور کا" نسیم

مرزا صاحب کے اشعار کے معنی کا ادراک بھول بھلیاں کی سیر ہے۔ ہر
ایک مصرع ایک گورکھ دھندا ہی کا چھلا نظر آتا ہے۔ الفاظ ہتھیلی پر دھرے
ہیں اور

"افلاج نیان آفرینش"

معنی پر دسترس نہیں۔ آسانی پر درخواستیں گزریں۔ مشکلات پر شکایتیں
ہوئیں۔ ناچار مرزا صاحب کو دقت پسندی کا اعتراف کیے بغیر نہ بنی۔ فرماتے
ہیں کہ جس طرح نایاب عنقا کسی کے جال میں نہیں آسکتا، اسی طرح آگہی،
وہ سننے کا جال، جس سے طائرانِ معنی کا شکار کرتے ہیں، جتنا چاہے
پھیلائے، بچھائے مگر میری تقریر کی دنیا کا مدعا "عنقا" ہے۔ وہ کسی
رنگ سے، کسی ڈھنگ سے، کسی کا پھندا نہیں کھا سکتا۔ کسی کے ہاتھ
نہیں آسکتا۔

ماحصل : گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اسیری = قید
آتش زیر پا = آگ پاؤں کے تلے، جسے اردو میں تلووں سے لگی ہوئی کہتے ہیں۔
موئے آتش دیدہ = آگ پر رکھا ہوا بال   حلقہ = کڑی

وحشت کی بیقراریوں کا بیان اور بیابان جنوں کی گرم روی کا ذکر ہے۔ دیوانوں کے لیے مقید رہنا ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قید کی روک ٹوک میرے لیے سدِ راہ نہیں ہو سکتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ تابستانِ جنوں میں گرم ریتی پر میرے تلووں سے ایسی لگی ہے کہ اس کی حرارت سے زنجیر کے حلقے آگ پر رکھے ہوئے بال کی طرح جل بھن جاتے ہیں اور میرے جنوں انگیز قدم کو روک نہیں سکتے۔ آگ پر کوئی شخص قدم نہیں رکھ سکتا اور جب پاؤں ٹھہرتا ہی نہیں تو اس سے زیادہ اور کیا تیز روی ہو سکتی ہے۔

ماحصل: مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

۲

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسد، غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جراحت = زخم   الماس = ہیرا   ارمغاں = تحفہ

مصائبِ الفت کا بیان ہے۔ بدنصیبی سے اہلِ دنیا کی ایذا رسانی کا ذکر ہے۔ عالمِ عشق میں کسی دوست، کسی آشنائے آرام نہ پہنچنے کا اظہار

مدِنظر ہے۔ فرماتے ہیں کہ جن کو میں غم خوار جانتا تھا اور جو لوگ میری ہمدردی کا دعویٰ کرتے تھے وہ بدقسمتی سے آزاردہندہ نکلے۔ دوستوں کے لیے تحفہ تحائف لانے کی پرانی رسم ہے۔ ہدیہ اور تحفہ وہ دوست لاتے ہیں جن سے کچھ خصوصیت ہوتی ہے اور وہ خالص دوست شمار کیے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اپنے دنیادار یاروں کا یوں رونا روتے ہیں کہ وہ تحفے میں جراحت، ارمغان میں کلیجہ چھیدنے والا ہیرا اور ہدیے میں داغِ جگر لے کر آئے ہیں۔ زہرخند کے طور پر فرماتے ہیں کہ مبارکباد دیجئے میرے غم خوار تشریف لائے ہیں۔ زمانے کے خاص دوستوں کی اس دل آزاری پر دشمنوں کی دشمنی کا احساس کر لینا چاہیے۔

ماحصل :

دوستوں سے اس قدر پہنچی ہیں ایذائیں مجھے
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

۳

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

جُز = سوا
قیس = مجنوں کا نام ہے، جو عرب کے قبیلۂ عامر سے تھا۔
صحرا = جنگل بروئے کار = کام کے لیے سامنے آنا (ظاہر ہونا)
بتنگی = تنگی کے ساتھ حسود = حسد کرنے والا

صحرا نوردانِ محبت کی بیکسی، غریبی، تنہائی کا تذکرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس امرِ دشوار کے انصرام کے لیے ہمت باندھ کر نکلا تو ایک مجنوں نکلا۔ لیکن ذوقِ محبت کی نعمت سے جو عام حاسد کی ہوا چلتی ہے اس نے مجنوں کی مصیبتوں

میں کسی کو شریک نہ ہونے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بدنصیب کے لیے فلکِ کج رفتار نے وسعتِ صحرا کو چشمِ حسود کی تنگی سے بدل دیا۔ حسد کی آنکھ دوسرے کو نہیں دیکھ سکتی۔ کسی نے دست گیری نہ کی۔ بیچارہ سنسان بیابان وحشت میں تن تنہا مرکھپ گیا۔ یا مرزا صاحب اپنی کربت و غربت کا حال لکھتے ہیں کہ میری تنہا روی اور دشت نوردی کے کٹھن مصائب میں کسی نے دادِ ہمدمی نہ دی۔ ایک بیچارہ قیس بردے کار آیا۔ باقی سناٹا ہے۔ اکیلا چنا کیا کرتا۔ جنوں کی دشواریاں آسان نہ ہوئیں اور اس کی ہم قدمی سے زنجیرِ وحشت کے عقدے نہ کھلے۔ گویا جنگل کا دائرہ حسد کی آنکھ کا حلقہ تھا جس میں کوئی ادر ہم چشم دکھائی نہ دیا۔

ماحصل: جنوں میں کوئی ساتھ کب دے گیا
کہ سایہ بھی یاں لوٹنے لے گیا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی = پریشانی، بکھرنا

سویدا = دل پر ایک سیاہ نقطہ ہے جیسے آنکھ میں سیاہ تل۔ سویدا دل کا میرِ مجلس ہے۔ جس طرح آنکھ کا خانۂ سامان تل ہے۔

سرمایہ = سامان   دود = دھواں

اس شعر کے معنی میں خیال کا انتشار اگرچہ کئی جانب میل کرتا ہے لیکن میرے نزدیک زیادہ قریب الفہم دو مطلب ہو سکتے ہیں، جن میں سے ایک نہ ایک مرزا صاحب کا مقصود ضرور رہا ہے۔ اول یہ کہ سویدا کو دل کا داغ تجویز کیا ہے۔ لیکن چوں کہ سودائے عشق نے اپنے خطرناک اثر سے دل کے میر سامان سویدا

کی حالت معرضِ ابتری میں ڈال دی تھی اس لیے بگڑی بنانے کے لیے سروسامان
سوختگی کی ضرورت تھی۔ سو شکر ہے گرمیِ سودائے محبت نے جو دل کے داغ
سویدا سے دھواں پیدا کیا وہی سویدا کی درستگی کا سرمایہ بن گیا۔ ظاہر ہے کہ
ہر شئے اپنے سروسامان کے بدون ناقص و غیر درست کہلاتی ہے۔ دھوئیں
کو آشفتگی لازم ہے اور داغ کو دھواں۔ داغ کون ہے؟ سویدا۔ اس
لیے جتنی آشفتگی بڑھی اس قدر نقشِ سویدا کے لیے سیاہی تیار ہوتی گئی اور
اس کا نقشِ سویدا درست ہو گیا۔

دوم یہ ہے کہ سویدا کا صورت پذیر ہونا سوزِ عشق کی بدولت ہوا یعنی سینے کے
داغ سے جو پریشان دھواں اٹھتا تھا وہ دل پر جمتے جمتے نقش آرائے
سویدا ہوا۔ آشفتگی باعثِ خرابی ہونی چاہیے لیکن اہلِ عشق کے لیے سوزِ
جنوں نے آشفتگی کو سبب درستی بنا دیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کی
ضد ہیں۔ ان امور سے ثابت ہوا کہ داغدار دل یا جگر سے دودِ زیاد کا نمودار
ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں لہٰذا سوائے تیرہ بختی و سینہ سوزی داغِ عشق
سے اور کیا امید رکھی جائے۔

"می تراود زلبم آنچہ درآوندِ من است"

ماحصل : شمع کہتی ہے مرے سر سے دھواں اٹھتا ہے
تو نے روکیں دلِ پُرسوز میں آہیں کیوں کر

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

خواب = سونا (اور سوتے میں چیزوں کا معائنہ کرنا)

خیال = سوچنا، گمان کرنا (خواب میں جو وہمی صورتیں نظر آتی ہیں انھیں

بھی خیال کہتے ہیں ، طبیبوں کے نزدیک خیال ایک قوت کا نام ہے جو حصۂ مشترک سے حاصل کی ہوئی صورتوں کو محفوظ رکھتی ہے گویا حصّۂ مشترک اشیا کی صورتوں کا مہتمم خزانہ ہے اور اس کا صندوقچہ خیال ہے۔

زیاں = ٹوٹا سود = فائدہ

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بازارِ ہستی میں کسی مسافر کے لیے کوئی پونجی بہم نہیں پہنچ سکتی۔ یہ جیسا تہی دست آیا ہے ویسا ہی خالی ہاتھ جائیگا۔ چنانچہ جتنے معاملے مجھ کو پیش آئے ، وہ خیال کا سیاح خواب کے عالم میں میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ہر ایک معاملے کے لیے نفع و نقصان کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہاں کے معاملات ، صورتِ خیالی کی طرح بے اصل و بے بنیاد ہیں۔ صورتِ خیال کا وجود خواب تک ہے اور خواب کا وجود غفلتِ چشم تک۔ جب آنکھ کھل جاتی ہے ، نہ خواب رہتا ہے ، نہ خیال۔ آنکھ کا کھلنا اصطلاح میں متنبہ ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی جب آدمی دنیا کی بے ثباتی سے واقف ہوتا ہے اور اس کی چشمِ غفلت سے پردے اٹھ جاتے ہیں ، تو کائنات کا بے وجود ہونا اور سرمایۂ ہستی کا بے سود ہونا اس کو صاف صاف نظر آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بازار کے معاملات کا نفع و نقصان فانی ہے اور جو چیز تھوڑی دیر رہ کر نابود ہو جائے ، اس کا عدم و وجود برابر ہے۔ اس لیے نہ زیاں زیاں ہے ، نہ سود سود۔ اور یہاں کی اجناس بے بود و بے سود۔

ماحصل : اے تہی دست رفتہ در بازار
ترسمت برنیاوری دستار

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز

لیکن یہی کہ "رفت"، گیا اور "بود" تھا

مکتب = لکھنے پڑھنے کی جگہ ، ہنوز = اب تک ، رفت = گیا ، بود = تھا

دفترِ عشق کے طومار کا بیان ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبت کا طول طویل دفتر کبھی اختتام کو نہیں پہنچتا۔ ایک میں ہی اس مدرسہ کا متعلّم ہوں، لیکن باوجودے کہ نسخۂ حیات قریب الختم ہے، مگر ہنوز تعلیم کی وہی ابتدائی حالت ہے۔ صفوۃ المصادر پڑھنے والے اطفالِ مکتب کی طرح رفت و بود تک پہنچا ہوں۔ پھر اس فن کی تکمیل کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور محبت کی نیرنگِ عشق کس طرح ہو سکتی ہے۔

یا مرزا صاحب کی مراد یہ ہے کہ عشق و محبت کا ماحصل کچھ نہیں۔ منتہی طالبعلم ہمیشہ مبتدی رہتے ہیں۔ تمام عمر کی تحصیل سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ورق گردانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھ کو دیکھو کہ میری زندگی آخر ہونے آئی ہے۔ مگر آج تک عشق کا محنت نامہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا، برابر سبق لیتا رہتا ہوں۔ لیکن رفت و بود کے سوا دوسرا سبق یاد نہیں۔ جو شئی ہاتھ سے جا چکی، اس سے کیا حصول۔ جو اس وقت سے پہلے تھے، اس سے کیا فائدہ۔ غرض عشق کے مدرسہ میں کسی درس خوان کی اصلاح حال ناممکن ہے اور گزشتہ را صلوٰۃ۔

ماحصل: اگر صد گنج علم از بر بخوانی
چو آشفتی، الف تا یے ندانی

ڈھانپا کفن نے داغ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

کفن = مردے کا لباس ، عیوب = عیب کی جمع ، برہنگی = ننگا ہونا

لباس = کپڑے ، ننگ = عار ، وجود = ہستی ، ہونا

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میری ہستی سے وجود کو داغ لگ گیا ہے۔ میں پیدا ہو کر خواہ کسی لباس کو، کسی وضع کو اختیار کرتا، لیکن میری عیب دار ہستی کے عیوب پوشیدہ نہ ہوتے۔ کیوں کہ میرا وجود ہی ننگ وجود تھا۔ اس لیے میرا معدوم ہونا میری پردہ پوشی کا باعث ہوا ورنہ کسی اور صورت سے ممکن نہ تھا۔

ماحصل : ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا، تو کیا ہوتا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن ، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

تیشہ = بسولہ ، کوہکن = پہاڑ کھودنے والا (فرہاد کا لقب)
سرگشتہ = سر پھرا ہوا ، درد سر والا
خمار = نشہ کا اتار (خمر سے مشتق ہے) یعنی وہ کیفیت جو شراب سے حاصل ہو۔
رسوم = رسم کی جمع (ریت کے معنی)
قیود = قید کی جمع ہے (قید = پابندی)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں کوہستانِ عشق کا وہ آزاد رہرو ہوں کہ مجھے موت کے لیے جو انتہائے عشق کی دلیل ہے کسی حیلے یا بہانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جان چرانے والے گرفتاروں کا کام ہے۔ جب پھنس گئے تو مرنے کی رسم کو آلاتِ مرگ سے ادا کیا۔ میری مسلک روحی ایسے سخت جانوں کو لذتِ عشق پر مرنے والا تسلیم نہیں کرتی، جیسا کہ کوہکن یعنی فرہاد نے تیشہ کھایا اور مدتوں پتھر اڑ ہوئے، تب کہیں بڑی مشکل سے جان دینے کی

نوبت پہنچی اور اس میں بھی تیشہ سے مدد لینی پڑی۔ کمال عشق کے معنی یہ تھے کہ معشوق کا جلوہ دیکھتے ہی کسی اعانت بغیر مر جاتا، نقدِ جاں کرشمۂ حسن کی نذر کر جاتا اور یہ کس کام کا کہ :

ہجرِ جاناں میں گئی جان بڑی مشکل سے
میری مشکل ہوئی آسان بڑی مشکل سے

ماحصل : "پختہ کارانِ جنوں را کے حیاز بخیر پاست"

ہمتِ قطرۂ شبنم ہے عرق ریز جبیں
کہ بیک پرتوِ خورشید فنا ہو جانا

۴

کہتے ہو "نہ دینگے ہم" دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

اس شعر میں شرح طلب بات کوئی نہیں ہے، فقط اتنا ہی مقصود ہے کہ معشوق کو دل کا واپس کرنا منظور نہیں ہے۔ لیکن وہ اس رمز کو دوسری صورت میں ادا کرتا ہے یعنی کہیں پڑا پایا جائیگا تو تمہارا دل نہ دیا جائیگا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دل تو پہلے ہی غتربود کر چکے ہو، وہ آپ سے دور کہاں ہے کہ کہیں پڑا پائیے۔ آپ دینا نہیں چاہتے۔ خیر، نہ دیجئے۔

ماحصل : آں شوخ چناں ربود از من
گویی کہ دلم نبود از من

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

عاشق کو دردِ معشوق جان سے زیادہ پیارا ہوتا ہے کیوں کہ محبت کے میٹھے درد میں رہ رہ کر مزا آتا ہے ۔ طبیب یا ناصح جو اس درد کو کھونا چاہتے ہیں، عاشقان دردمند کو کیسے زہر معلوم ہوتے ہیں ۔ اس واسطے درد کا بے دوا ہونا ان کے درد کی دوا ہے

ماحصل : درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا

دوست دار دشمن ہے ، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی ، نالہ نارسا پایا

معشوق دشمن کا دوست رکھنے والا ہے ۔ اس لیے دل کی آہ و زاری پر اعتماد نہیں ہو سکتا کیوں کہ کسی آہ نے معشوق کے دل سے دشمن کی دوستی نہ نکالی اور دونوں میں کسی نالہ نے جدائی نہ ڈالی ۔ یا معنی یہ ہیں کہ معشوق ہمارا دشمن جانی ہے کیوں کہ اس کی بے اعتنائیوں اور بے پروائیوں سے ایک روز جان جاتی ہے اور دل اسے دوست رکھتا ہے ۔ اس لیے میں اس بغلی گھونسے پر بوجہ نفاق اعتماد نہیں رکھتا ۔ کیوں کہ وہ کبھی دل سے آہ نہیں کرتا کہ اثر ہو ۔ وہ کبھی دل سے نالہ نہیں کھینچتا کہ رسا ہو ۔ لہٰذا ایسا دل قابلِ اعتماد نہیں ہے :

ماحصل : یارِ ناپایدار دوست مدار
دوستی را نشاید ایں غدار

سادگی و پرکاری ، بےخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

معشوق جان کر انجان بنے ہیں بیوقوفی کے پردے میں عقلمندی کی ہے اور دانستہ عشاق سے بیخبری کرتے ہیں۔ گویا بےخودی کے لباس میں ہشیاری ہے۔ لہٰذا حسن کا تغافل، آشفتگانِ محبت سے غفلت نہیں ہے بلکہ وہ عاشقوں کی جرأت و ہمت کو آزماتے ہیں کیوں کہ اگر معشوق متوجہ ہو تو جھوٹے سچے عاشق بھی جان فدا کرنے کو تیار ہیں اور جس کو سچا عشق ہے اس کی شاہراہِ محبت میں معشوق کی بےخبری سدِ راہ نہیں ہوتی کیوں کہ مدہوشی کوئی وسوسہ نہیں آنے دیتی اور جس کے دل میں معشوق کی طرف سے علاحدہ محبت کے کوئی اور خیال پیدا ہو، وہ پورا عاشق نہیں ہے:

ماحصل قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

فقط وابستہ دل کا خون ہونا اور راہِ محبت میں کھویا جانا بیان کیا ہے۔ یعنی جس طرح غنچہ کثرتِ سرخی سے پرخوں دکھائی دیتا ہے اور جس طرح نشو و نمائے بہار سے پہلے کسی ڈالی میں کسی کلی کا پتا نہ تھا اسی طرح ہمارا دلِ پرخوں گم تھا۔ آج غنچوں کو دیکھ کر دل کا سارا رنگ ڈھنگ نظر آگیا۔ کیوں کہ دلِ آوارہ کے سوا کون گم ہو سکتا ہے اور دلِ پرحسرت کے سوا کسی اور شئی کا خون ہونا بھی معلوم ہو نہ ہو جسے غنچہ کہتے ہیں، یہی ہمارا دل ہے۔

ماحصل: سر سے پا تک لہو ہے دل میرا

غنچۂ آرزو ہے دل میرا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

فقط مراد یہ ہے کہ یہ وحشی دل ہمارے پاس نہیں ٹھہرتا۔ ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ اگر بمشکل بہلا پھسلا کر لائے بھی، تو پھر چل دیا ہم ڈھونڈتے رہ گئے۔ اور وہ تمہارے پاس جا پہنچا۔ القصہ ہم نے ہمیشہ ڈھونڈا اور کبھی نہ پایا۔ اور تم نے کبھی نہ ڈھونڈا اور ہمیشہ پایا۔

ماحصل: آں شوخ چناں ربود از من
گوئی کہ دلم نبود از من

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

اپنا لذت گیرِ محبت ہونا اور ناصح کا بے درد و بے حس ہونا ثابت کرتے ہیں اور ضمناً ناصح کی نصیحت جگرخراش کی ایذا رسانی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ عاشق کے لیے نصیحت زخم پر نمک افشانی ہے بھلا مجروحانِ محبت کو تو اس میں بھی ایک مزا آتا ہے۔ کیوں کہ عشق از روئے فطرت آزاد پسند ہے لیکن ناصح کو اپنی بیہودہ بکواس کا کوئی مزا نہیں ملا لہٰذا آئندہ خاموش رہنا چاہیے۔

۵

دل مرا سوزِ نہاں سے، بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

سوزِ نہاں = اندر کی لگی ہوئی

بے محابا = بے تکلف، سراسر، بلا لحاظ، بے مروتی سے

آتشِ خاموش = وہ آگ جس میں لپٹ نہ ہو، وہ آگ جو بھڑکی نہ ہو، وہ آگ جو چپکے چپکے جلے

عجب سی آگ دل میں لگی تھی، لیکن ضبط وضع اور پاس رسوائی نے بھڑکنے نہ دی۔ اس لیے اس آگ کی طرح جو چپکے چپکے جلتی ہے، دل جل بھن کر خاکِ سیاہ ہو گیا۔ "خاموش" اور "گویا" تناسب شاعری ہے۔

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہ تھی
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اسی محبت کی آگ کا انجام بیان کرتے ہیں کہ شوقِ وصل جو عاشق کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، یادِ یار جو کسی آن جدا ہو نہیں سکتی۔ یہ دونوں خانۂ دل کے اس المال خیال کیے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبت کا انجام اور اس کی خانہ سوزی کی نہایت یہ ہے کہ جس شئے نے آگ لگائی ہے، وہ بھی جل گئی۔ یہ بہت لطیف بات ہے کہ جب آگ کسی شئے میں لگاتے ہیں تو وہ شئے جل جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ آگ بھی راکھ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک چنگاری کسی لکڑی میں رکھ کر جلائیں تو چنگاری بھی لکڑی کے ساتھ نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یادِ یار نے شوقِ وصل پیدا کیا اور شوقِ وصل نے آگ لگائی لہٰذا گھر مع سامان جل گیا، کیوں کہ کوئی بجھانے والا نہ ہوا۔ دیدار ہوتا تو یا دٹھنڈی پڑتی۔ وصال ہوتا تو شوق منطفی ہو جاتا۔ جس گھر میں آگ

بجھانے کی کوئی ترکیب بن نہ پڑے، وہاں تا وقتیکہ کوئی چیز جلنے والی رہے گی، آگ گل نہ ہوگی۔

اگر بنظرِ تصوف دیکھیے تو یہ عارف کے لیے فنا کا مقام ہے۔ مرزا صاحب صوفی نہ تھے، اس لیے ہم ان کے کلام کو تصوف میں ڈال کر مصطلحاتِ تصوف کا اظہار اور اپنے مبلغِ علم کا جتانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ورنہ ہر شعر کے معنی ہیں دریا بہہ سکتے ہیں۔ لیکن بحث سے خارج گفتگو یا دور از کار احتمالات، مخلِ فصاحت الفاظ اور مستعمل معنی لغت لکھ لکھ کر کاغذ کا منہ سیاہ کرنا اور ناظرین کا وقتِ عزیز کھونا نامناسب اور خودنمائی سمجھتے ہیں۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے، بالِ عنقا جل گیا

محویت کا بیان ہے۔ فناء الفنا کا مقام ہے۔ عارف کثرتِ مجاہدات سے آپ کو فنا کرتا ہے، جس کی نسبت ارشاد ہوا ہے:

موتوا قبل ان تموتوا

شیخ ترجمہ کرتے ہیں:

"خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی"

وجود کے بعد عدم ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں یہ مرتبہ تو مجھ کو پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا کیوں کہ عنقا وہ طائر ہے جس کا آشیانہ صحرائے عدم میں شاخِ نیستی پر ہے اور ہماری آہِ آتشیں کی لو سے اس کے بال و پر اکثر جل گئے ہیں۔ اب کے ہمارے نالوں سے عنقا کے پر و بال پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اب ہم بیابانِ عدم میں جہاں عنقا کا نشیمن تھا، نہیں ہیں۔ گویا ہمارا طائرِ دل بوستانِ غیب الغیب میں چہچہا رہا ہے اور وجودِ فانی

کے مٹا دینے کے بعد ہم کو بقائے دوام حاصل ہوئی ہے۔ مرزا صاحب نے شاعری کو تصوف کے رنگ میں ڈال کر شعر کو بلند کیا ہے۔ ورنہ حضرت کا سارا جمع خرچ زبانی تھا۔

ماحصل :
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

عرض کیجے، جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں!
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

سوزِ محبت اور آتش عشق نے میرے سراپا میں ایسی آگ بھر دی ہے کہ میری ذات کا تو کیا ذکر میرے خیالات ایسے آتشناک ہیں کہ خیالِ صحرا سے صحرا میں آگ لگ گئی۔ خدانخواستہ اگر زیادہ وحشت اچھلتی اور میں خود جانبِ صحرا نکل جاتا، تو خدا جانے کہاں کہاں آگ لگتی اور کیا کیا ہوتا۔

ماحصل :
نالہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
آگ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارزما جل گیا

چراغاں = بہت سے چراغ، جشن، روشنی

کارفرما = حکم دینے والا، کسی کا کام بنانے والا، کام لینے والا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سوزِ دروں کا حال کس طرح ظاہر ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ جلن سے دل میں داغ نمایاں ہوتے ہیں اور ان کی روشنی چراغوں کی طرح دور پھیلتی ہے۔ اب تو بیدلی کا عالم ہے۔ حضرتِ دل ہی جڑ سے ندارد ہیں۔

جب کوئی جشن ہوتا ہے، تو رات بھر روشنی کی جاتی ہے۔ چراغ افروزی کا بادشاہی حکم کو بکو منادی کرتا ہے اور سو بسو روشنی کرتا ہے۔ تو ہمارے سینے کی اقلیم میں داغوں کے ذریعہ سے چراغاں کیوں کر ہو سکتا ہے۔ یہاں تو حضرت بادشاہ ہی فی النار ہو چکے ہیں۔

ماحصل: دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہ تھی
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

افسردگی = ٹھٹھر جانا تپاک = گرمیٔ دل (جوش کے ساتھ ملنا)

فرماتے ہیں کہ کثرت کی خوب بہار دیکھی، اب وحدت کی ٹھہر گئی۔ جلوت کے خوب گل چھرّے اڑائے، اب خلوت کا زمانہ بھی بجھے ہوئے چراغ کی طرح ایک گوشۂ ظلمت میں سب سے جدا اپنی افسردگی اور پژمردگی کو لیے ہوئے بیٹھ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں کہ شگفتہ دلی بدون جلسۂ احباب، صحبتِ دوستاں ناممکن ہے اور دنیا اور اہلِ دنیا کے تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ۔

السلامة بین الوحدة والآفات بین الاثنین

سلامتی اکیلے رہنے میں ہے اور دو کے ساتھ آفتیں لگی ہوئی ہیں

لیکن تنہائی باعث افسردگی ہے اور جلسۂ احباب باعث شگفتگی۔ مگر تنہائی سے افسردگی کے سوا کچھ اور نقصان نہیں۔ دنیا کی ناقابلِ اطمینان ملاقاتوں سے سخت اذیتیں پہنچتی ہیں، جن سے زندگی وبالِ جان اور دوبھر ہو جاتی ہے۔ جب آدمی دو بلاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ مثل ہے:

"بمرگش گیر تا بہ تب راضی شود"

موت کی دھمکی دو گے تو زحمت اختیار کریگا اور بلا وجہ کوئی تپ اور زحمت گوارا نہ کریگا۔ اس لیے ایسی فتنہ انگیز زحمتوں یا صحبتوں سے جس کا نتیجہ نقصانِ جان و مال ہے، دل کی افسردگی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے اور اہلِ ملاقات کا پُر مکر و زورِ تپاک بھلا نہیں لگتا۔

ماحصل: بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں، جو یوسف سا برادر پائیں

۶

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

شوق = دل کی خواہش، تڑپ جانا

رقیب = نگہبان، چوکسی کرنے والا (اصطلاح میں مخالف اور دشمن کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ جو شخص کسی کے حالات کی نگہبانی کریگا وہ اس کی خواہشوں کا سدِّ راہ ہوگا اور یہی سبب خصومت ہے۔ حقیقت و مجاز میں ایک مناسبت بالمعنی پیدا کرتی ہے۔ مرزا صاحب نے شعر میں اصطلاحی معنی لیے ہیں۔)
فرماتے ہیں کہ شوق کسی ساز و سامان کو اہلِ شوق تک اور کسی مشتاق کو ساز و سامان تک نہیں پہنچنے دیتا جیسا کہ رقیب کسی کا آنا معشوق تک اور معشوق کا جانا کسی غیر تک کبھی گوارا نہیں کرتا۔ اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے احوال کی نگہبانی کرتا ہے، اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ہر صدمے اور ہر بری چیز سے محفوظ رہے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ زید کے لیے غذا کی حفاظت کرو، تو مراد یہ ہوگی کہ کوئی زہریا زہریلی چیز نہ کھا جائے کہ اس کو ضرر پہنچے، نہ یہ کہ اس کا دانا پانی بند کر دیا جائے۔
بنا بریں چوں کہ سرو سامان کی طرف متوجہ ہونا کمالِ عشق کو نقصان دینا ہے

اور عاشق کامل کو داغ لگاتا ہے اس لیے شوق صادق ہر طرح سے سر و سامان کا مخالف اور رقیب ہے، اور عاشق تک نہیں پہنچنے دیتا۔ قیس مشہور عاشق تھا۔ اس کا حال دیکھیے کہ وہ عالم تصویر میں ننگ دھڑنگ پیدا ہوا۔ یہ اشارہ ہے کہ قیس کی تصویر بھی برہنہ و عریاں کھینچی جاتی ہے۔ یعنی شوق کی خانہ خرابی عالم اجسام سے عالم تصویر تک پہنچتی ہے۔ مرزا صاحب کے بیان میں ثابت ہوا کہ ارباب نام و ننگ کو کارِ عشق اور رقیب شوق سے احتراز ضرور۔ ورنہ نوبت بایں جا رسید

ماحصل : اک مدت پائے حنا ہے، اک مدت گلخن تابی کی
عرصہ ہوا ہے گھر سے نکلے، عشق نے خانہ خرابی کی

بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

فرماتے ہیں بوئے گُل کے اجزا جب ہوا میں مل کر چہار سو پھیلتے ہیں، اسی کا نام انتشار ہے۔ رہا نالۂ دل، دل کی دردناک آواز کا نام ہے۔ آواز کی اشاعت منحصر ہے ہوا کی وساطت پر، اور ہوا کا محیط ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا نالۂ دل کا چار سو منتشر ہونا لازمی ہے۔ دود، چراغ محفل کا رنگ ہے اس کے اجزاء بھی ہوا کی حرکت سے ٹوٹ کر ہر طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس کو بھی دوسرے لفظوں میں پریشان کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ عاشق اس کی محفل سے پریشان ہو کر نکلا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہاں تو غیر ذی روح اشیا بھی پراگندہ ہو کر نکلتی ہیں، جن پر عشق کی پریشانی کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ چہ جائے کہ انسان جو ہر حالت کا ادراک کر سکتا ہے، کیوں کر پریشان نہ ہو

ماحصل: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے، ہم نکلے

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدہ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں نکلا

حسرت زدہ = حسرت کا مارا ہوا، وہ شخص جس کی کوئی حسرت نہ نکلی ہو۔
مائدہ = دسترخوان

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے دلِ مایوس کی بساط پر درد کی حسرتیں چنی ہوئی تھیں۔ وہ لذت درد کا دسترخوان تھا۔ لیکن چوں کہ دراصل حسرتوں کا مارا ہوا تھا اس لیے لب و دنداں کے سوا کوئی اس سے کامیاب نہ ہوا۔ قاعدہ ہے کہ جب آدمی کو کسی شئی کی حسرت ہوتی ہے، تو اسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ درد کی لذت بھی دلِ حرماں نصیب سے پوری پوری حاصل نہ ہوئی اور یہ مزا کافی طور پر میسر نہ ہوا کہ دل و جگر کو بھی کیفیت ملتی۔ حسرت نے لب و دنداں سے لذتِ درد کو کبھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہاں بھی ہونٹ چاٹ کر رہ گئی۔

ماحصل: نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا
وار اک اور بھی لگانا تھا

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میری ہمتِ دشوار پسند نے دنیا کی ہر ایک شئی کو پکڑا اور چھوڑ دیا۔ کیوں کہ دشوار پسندی ہر ایک شئی کو سبک سمجھتی رہی اور آگے بڑھتی

رہی ۔ گویا ہر ایک شئ کو فنا کرتی رہی اور دستِ طلب سے گم کرتی رہی ۔ کیوں
کہ بموجب حدیث شریف :

"موتوا قبل ان تموتو"

اس نے آخر کار مرگ کو پسند کیا جو مشکل ترین سوانحِ عالم تھا ۔ ہمتِ دشوار پسند
اس سے بھی خوش نہ ہوئی کیوں کہ وہ دشوار پسند تھی اور یہاں سہولت نکلی ۔
دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمتِ دشوار پسند نے کائناتِ ہستی کو ترک کیا اور
ملک دمال دجاہ و جلال دنیا پر لات مار کر سبقِ فقر و فنا پڑھانا شروع کیا لیکن
اس کی دشوار پسندی کے نزدیک سرمایۂ ہستی کا ترک کرنا اور خودی یا خرابات
دنیوی ایسی ناچیز شئ کا فنا کر دینا کوئی بڑی بات نہ نکلی ۔ دنیا میں فنا
سے بڑھ کر کوئی دشواری نہ تھی ۔ مگر اس نے اس کو بھی خفیف سمجھا ۔
کہیے ، ایسی ہمتِ دشوار پسند کو کہاں لے جائیے ؟ سخت مشکل ہے ۔

ماحصل : ترکِ دنیا میں سوچ کیا ناسخ
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا ، وہ طوفاں نکلا

اس شعر کے معنی صاف ہیں ۔ اس میں کوئی شرح طلب بات نہیں ہے ۔

۷

دھمکی میں مرگیا ، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ ، طلبگارِ مرد تھا

باب = لائق ، قابل نبرد = لڑائی
نبرد پیشہ = لڑاکا ، جھگڑالو ، جنگجو طلبگار = ڈھونڈنے والا

معنی یہ ہیں کہ جو لوگ عشق کے حریف ہوئے، یعنی عشق کی طرف بڑھے اور عشق کی لن ترانیاں کیں، وہ دل کے ایسے بودے نکلے کہ میدانِ امتحان میں اس جنگجو کی ایک ہی ڈانٹ میں جان بحق ہو گئے جیسے فرہاد وقیس وغیرہ۔ یہ لوگ دعویِ عشق میں ناقص تھے۔ کامل ہیں، تو ہم ہیں کہ اس خونخوار کے ساتھ میدانِ محبت میں آج تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ قدم شجاعت مڑے کے پیچھے نہیں۔ سر پر ہزاروں وار جھیلے، ہزاروں زخم اٹھائے، سیکڑوں تلواریں کھائیں اور منہ نہ پھیرا۔

ماحصل: سر دل پہ دار لیے، اُن نہ کی شہیدوں نے
یہ کاسہ وہ نہیں جن سے صدا نکلتی ہے

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

فرماتے ہیں کہ مرگ کی مشکلات کا کیا ذکر ہے۔ میری زندگی بھی راحت و آرام سے نہ گزری کیوں کہ موت کے دھڑکے سے جینا وبالِ جان رہا۔ جوہرِ روح کو رنگ فرض کیا ہے اور رنگ کے اڑ جانے کی حالت مرگ تسلیم کی ہے۔ جب تک رنگ جما رہتا ہے، سرخی نمودار رہتی ہے، جب رنگ اڑ جاتا ہے، تو زردی چھا جاتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں۔ مجھے باغِ زندگی میں آ کر برگِ خزاں کی طرح ہاتھ ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ جو کیفیت بعدِ فنا روح کی ہوتی ہے، وہی زندگی بھر رہی اور جینا مرنا برابر رہا۔

ماحصل: تمہارے عاشقانِ لب کے کیوں کر دن گزرتے ہیں
کنارِ آبِ حیواں ہیں، نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ میں چمنِ ہستی کا وہ درخت ہوں کہ جس میں

کھٹکا لگا ہوا ہے۔ باغباں پھلدار درختوں میں اس لیے کھٹکا لگا دیے ہیں کہ جانور نقصان نہ پہنچائیں۔ جب کوئی طائر آ بیٹھتا ہے، تو کھٹکا ہلا دیتے ہیں، وہ اڑ جاتا ہے۔ آپ کو درخت فرض کیا ہے اور دھڑکتے دل کو کھٹکا، رنگ کو طائر، نقصان کو موت۔ یعنی: نقصان کے خوف سے دل کا کھٹکا ہلتا رہا، اس لیے رنگ کا طائر کبھی نہ بیٹھنے پایا اور بیٹھا تو فوراً اڑ گیا۔ میری حیات پر کبھی بہار کا رنگ نہ جما، ہمیشہ خزاں کی طرح زردی عارضِ حال رہی۔

ماحصل: تختۂ گلہائے گلزارِ فنا کچھ بھی نہیں
یہ چمن دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ بھی نہیں

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تالیف = جمع کرنا، محبت کرنا، مائل کرنا
نسخہ = دوا کا نسخہ لکھا ہوا وفا = پورا کرنا
مجموعہ = جمع کیا ہوا (بہت سی چیزیں ایک جگہ کی ہوئیں)
خیال = خیال، دھیان
فرد فرد = الگ الگ، ایک ایک

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وفا ایک ایسا نقشِ بال عنقا تھا کہ جس کا وجود نام کے سوا اور نہیں پایا جاتا۔ میں نے چاہا کہ دنیا میں ہر ایک قوم اور ہر ایک گروہ کے دفاتر دیکھوں اور ان سے مضمونِ وفا انتخاب کروں، لیکن کہیں حرفِ وفا کا پتا نہ لگا۔ اس واسطے میرا مجموعۂ خیال پریشان رہا کہ کہاں جاؤں اور کدھر ڈھونڈوں۔ کیا تحقیق کروں۔ اور ہر ایک کام کے انجام دینے کے لیے

خیال کا فراہم ہونا شرط ہے ۔ خیال جب ہی فراہم ہو سکتا ہے کہ تلاش و تردّد باقی نہ رہے ۔ اور یہ میسّر نہ ہوا کیونکہ کہیں معنی وفا کا نشان نہ ملا ۔ لہٰذا وفا کے نسخوں کی تالیف نہ کر سکا اور مضمون کی نایابی سے تالیف میں ناکامی ہوئی ۔

ماحصل : یا وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ قسمت نے ایسا پلٹا کھایا ، زمانے میں ایسا انقلاب ہوا کہ عیش نے طیش کی صورت پکڑلی ۔ عشرت عسرت سے بدل گئی ۔ دل کے گلدستے میں جہاں رنگا رنگ کے پھول بہار دکھا رہے تھے ، داغوں کا لالہ زار پھولا ہوا ہے ۔ جب مسرت اور شادمانی کا رنگ اڑ گیا تو حسرت اور ارمان کے خون نے جوش کیا اور ایسا جوش کیا کہ دریائے خوں کا ایک کنارہ جگر نظر آتا ہے ۔ یہ وہی مقام ہے کہ جہاں کی گرد جلوۂ گل تھی ، یا جہاں جلوۂ گل گرد تھا ۔ یعنی جہاں عیش کی رنگ رلیاں رچی ہوئی تھیں ، وہاں عیش کی خون خرابی دکھائی دیتی ہے ۔

ماحصل : محفلِ عیشِ طرب ، گنجِ شہیداں بن گئی
ہائے ، خونِ آرزو کا خوں بہا کچھ بھی نہیں

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا ، تو وہی دل کا درد تھا

کشمکش = تردّد ، کھینچا تانی

کوئی اشکال نہیں ہے، صاف ظاہر ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق و محبت کی بنیاد فسادِ دل ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس کافر کا زلفوں کی بدولت کالا منہ ہوا۔ اب سارے جھگڑے اور خرخشے مٹ گئے۔ مگر توبہ، ہم ایسے خوش نصیب کا ہے کو تھے کہ پھر بھی چین سے رہتے اور حضرت دل بھی ایسے بھلے مانس نہ تھے کہ ہم کو تن تنہا چھوڑ جاتے۔ آپ تو رخصت ہوئے مگر اپنا درد چھوڑ گئے۔ دادا گیا، پوتا آیا، کنبہ جوں کا توں۔ بقائے درد کی دو صورتیں ہیں: دل سے رنج کا جدا ہونا باعثِ درد ہے، یا دردِ معشوق ہنوز باقی۔ سچ ہے، دل نہ جاتا تو نجست نہ ہوتی۔ یہ نہ ہوتی تو درد نہ ہوتا۔

ماحصل: یہ پارہ پارہ کلیجہ، یہ چاک چاک لباس
رفو ہوا، دل کافر، خراب کر کے مجھے

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

ملا کی دوڑ مسجد تک، چارہ ساز ظاہری جسمانی وحشت کا علاج کر سکے۔ ہاتھ میں ہتھکڑی، پیر میں بیڑی ڈال کر زنداں میں بند کر دیا۔ تو وحشت جاتی رہی، ذرا خوش تو ہو لو۔ یار دل کا خیال تو وہی بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ جب جانے کوئی اسے روک لے۔

ماحصل: نشتر چہ زنی رگِ جنوں را
آگاہ نئی تپِ دروں را

یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ تن کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا!

آمین ، ثم آمین ۔ بجاہِ محمد وآلہ الطاہرین ۔

۸

شمارِ سبحہ ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

شمار = گنتی سبحہ = تسبیح

مرغوب = بھایا ہوا ، مشکل پسند = کٹھن کاموں سے خوش ہونے والا ، دقتوں میں خوشی سے پڑنے والا ، مشکلات سے نہ گھبرانے والا ۔

بیک کف بردن = ایک ہاتھ سے لے جانا ، ایک دفعہ لے جانا ، ایک جھپٹا مار کر لے جانا ۔

صد = سو

تسبیح کی دانہ شماری اُس مشکل پسند معشوق نے اس لیے پسند کی ہے کہ اس میں ایک ایک ہاتھ سے سو سو دل کے اڑا لے جانے کا طریقہ نظر آتا ہے ، ورنہ اس زنار بند بت کا ذکرِ تسبیح سے کیا تعلق ۔

ماحصل : جانتی ہے نگہِ ناز ٹھکانا دل کا
ایسے طرار سے مشکل ہے بچانا دل کا

بہ فیضِ بیدلی ، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

نومیدی = ناامیدی جاوید = ہمیشہ

کشایش = کھولنا

عقدہ = گرہ

امیدوں نے ہزار بلاؤں میں ڈال رکھا تھا اور وہ دل سے پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن شکر کا مقام ہے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ جب دل نہ رہا تو گویا امیدوں کی کھیتی برباد ہوگئی۔ چہار طرف مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ امید کی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔ کوشش مصیبتوں میں ڈالتی ہے اور کوشش امید تک ہے۔ مایوس ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی کا نام آرام ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھو، تو مایوسی کا جنگل طے کرنا ایک بڑا کٹھن کام تھا لیکن بیدل نے اسے بالکل آسان کر دیا، تو وہ عقدۂ مشکل جس کا نام مایوسی تھا، حل ہوگیا۔

دوسرے معنی: سب سے مشکل تر عقدۂ مایوسی تھا۔ لیکن ہمارے کشائش کار نے وہی عقدۂ مشکل پسند کیا اور یہی عقدہ سببِ عقدہ کشائی ہوا، کیوں کہ مقصود راحت و آرام تھا اور بوجہ ترکِ سعی کے ہمیشہ ناامیدی سے حاصل ہوا۔ عربی مثل ہے:

"الیاس احدی الرحتین"

ہندی میں بھی کہتے ہیں:

"آسا مرے نرا سا جیے"

ماحصل: شفیع ہر دو ہزار است روز بار پسیں
شبے کہ بر سرِ امیدوار نی گزرد

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوا = خواہش
سیرِ گل = پھولوں کی سیر
بے مہری = محبت کا نہ ہونا، نامہربانی، بیدردی

بخون غلطیدن = خون میں لوٹنا

بسمل = حلق بریدہ ، بسم اللہ کہ کر جس کا گلا کاٹا گیا ہو ۔ کوئی خاص لفظ اس وقت مختصر کر دیا جاتا ہے جبکہ کثرتِ استعمال سے عام میں اس کی پوری پوری شہرت اور رُشناسائی ہو چکی ہو ۔ بسمل اصل میں دم بسم اللہ تھا ۔ کیوں کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا اسلام کی ہدایت ہے ۔ کثرتِ استعمال سے دم بسمل رہا ۔ پھر دم کو بھی بعض لوگوں نے بے دم کر دیا اور سچ بھی ہے ، دم رہتا تو بسمل کیوں ہوتا ۔ نرا بسمل رہ گیا ۔ ظرف سے اکثر مظروف مراد لی جاتی ہے ، اس لیے بسمل ذبیحے کو کہنے لگے ۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق کو باغ کی گلگشت اور پھولوں کی سیر کچھ تفریحِ طبع کی غرض سے پسند نہیں ہے ، بلکہ وہ ایسا ظالم ہے کہ اس کی بے مہری اور ظلم کا رنگ سیرِ گل کی خواہش سے آئینہ کی طرح صاف ظاہر ہوتا ہے ۔ اس طرح کہ اس کو پھولوں کی سیر مدِّ نظر نہیں ہے ، بلکہ وہ گلوں کے رنگ کو خونِ بسمل اور چاکِ گل کو زخمِ بسمل سمجھ کر سیرِ لالہ و گل کو جاتا ہے ۔ جب ڈالیاں ہوا سے ہلینگی اور پھولوں کو حرکت ہو گی ، تو گویا خون میں تڑپتے ہوئے بسمل نظر آئیں گے اور وہ بے رحم ان کا تماشا دیکھے گا ۔

ماحصل : اس گل کو ہے جو اسے سر دکار
ہر رنگ میں ہے ستم نمودار

۹

دہر میں ، نقشِ وفا ، وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ ، شرمندۂ معنی نہ ہوا

دہر = زمانہ

نقش = لکھنا ، تصویر کھینچنا ، خط کھینچنا ، صورت بنانا ، لکیر کھینچنا ۔

وفا = پورا کرنا، نباہ کرنا

وجہ = سبب   تسلّی = دل کا ٹھہرنا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا میں جتنے الفاظ وضع کیے گئے، وہ ہمیشہ اپنے معنی دیتے رہے اور ان کا استعمال ان کے معنوں پر ہوتا رہا اور وہ باعثِ تسلی ہوا۔ مگر وفا کے واضع نے جس معنی کے لیے اس لفظ کو وضع کیا تھا، وہ اس طور پر نہ ہوا۔ یعنی کسی نے کسی کے ساتھ نباہ نہ کیا اور کسی نے کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔ اس لیے وفا کا لفظ کہیں صحیح بولا نہ گیا اور اس لفظ نے کبھی اپنے معنی کا اثر نہ دیکھا۔

ماحصل: یا وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

سبزۂ خط سے، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سبزہ = روئیدگی   خط = مسیں، محاسن

کاکل = سر کے اوپر کے بال لیکن استعمال زلف، گیسو وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔

زمرّد = پنا (ایک ہرے رنگ کا جواہر ہے)

حریف = مدمقابل   دم = سانس   افعی = سانپ

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا، کاکل افعی کی طرح بل کی لیتا رہا اور عاشقوں کو زہریلی اداؤں سے ایذا دیتا رہا۔ زمرّد کے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ خطِ زمرّد کی پیدا ہوا اور زلف کی ایذا رسانی

کا وہی عالم رہا۔ شاید یہ وہ افعی ہے، جس پر زمرد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط آنے سے سلطانِ حسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھا ہوا حسن خط کے آنے سے بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چہرے پر زلف کی اداؤں میں کمی نہیں آتی۔

ماحصل: یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عشق کی بلاؤں اور وفا کے بکھیڑوں سے چھوٹنا جیتے جی کسی طرح ممکن نہ تھا۔ میں نے تنگ آکر معشوق سے قتل کی فرمائش کی، یا موت کی دھمکی دی، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ افسوس ہے کہ مرگ وزیست کے دونوں عالم برباد ہو گئے اور کہیں آرام نہ پایا۔

ماحصل: تمہارے عاشقانِ لب کے دن کیوں کر گزرتے ہیں
کنارِ آبِ حیواں ہیں، نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

گزرگاہ = راستہ، آنے جانے کی جگہ خیال = دھیان

مے = شراب (مطلق شراب خانے کے سامان سے ہے، مضاف ہو کر ہر ایک شئی پر بولا جا سکتا ہے)

ساغر = آب، ساغرِ گلاب، ساغرِ شراب

نفس = سانس جادہ = بٹیا
سرِ منزل = منزل کا سرا تقویٰ = خدا سے ڈر کر برے کام نہ کرنا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دین و دنیا میں انسان کو کسی کا ہونا چاہیے۔ بہتر تو یہی تھا کہ ہر متنفس یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوتا اور ہر ایک نفس پر ذکرِ الٰہی جاری رہتا۔ جس طرح بٹیا پر آدمی چلتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ امر میسر نہ ہوا اور نفس کا فرنے ہنگامہ ہائے معاصی کی طرف باگ پھیر دی تو شیشہ و ساغر کا دھیان دل میں آنے جانے لگا۔ یہ بھی کسی قدر باعث سرور رہوا اور اس نے زندگی کو بے لطف گزرنے نہ دیا۔ اگرچہ دین ہاتھ سے نکل گیا، لیکن دنیا کا مزا تو کسی قدر حاصل ہوا۔

ماحصل: کبھی کا ہو کے رہے، یا دھیکا ہو کے رہے
غرض یہ خاک کا پتلا، کبھی کا ہو کے رہے

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے سے بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

گوش = کان منت = احسان گلبانگ = آواز

مرزا صاحب معشوق سے خطاب کرتے ہیں کہ اے معشوق! تجھ کو وعدہ وفا کرنے کی عادت نہیں ہے۔ جھوٹ سے انسان کا ناراضمند ہونا ضروری ہے۔ برخلاف میرے کہ میں تیرے جھوٹے وعدے سے اشاراضی ہوتا ہوں۔ کیوں کہ عاشقِ صادق مرحدِ عشق میں تسکین وتسلی کو ننگ سمجھتا ہے۔ تیرا وعدہ اگر سچا ہوتا، تو دلِ بیقرار تسلی پاتا اور پایۂ اعتبارِ عشق سے گر جاتا۔
دوسرے معنی یہ ہیں: میں وہ صاحب غیرت ہوں کہ کسی صورت سے کسی کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ خواہ میری ہی راحت کیوں نہ ہو۔ پس، اگر

تو وعدہ وفا کرتا، تو دل تسلی کی آواز کا ممنون ہوتا، اور نفسِ غیور کو شرمندگی حاصل ہوتی۔ شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔

ماحصل : درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

ہم ایسی خالی قسمت لے کر آئے تھے کہ کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوئے زمانے نے ہمارے ساتھ دشمنی کی تھی، تو ضروری تھا کہ وہ مضرتیں یا وہ مصیبتیں جو ہم کو مٹا دینے والی ہیں، زمانے کے ہاتھ سے ہم کو تکلیف پہنچاتیں۔ مگر آسمان کو ہمارے ساتھ ایسی ضد تھی کہ گو وہ ہماری موت کی فکر میں تھا، لیکن دنیا سے تنگ آکر ہم نے منہ سے موت مانگی، تو ظالم نے اس سوال کو بھی پورا نہ کیا اور ہم ویسے ہی نیم بسمل تڑپتے رہے۔ افسوس!

ماحصل : وہ بھی ہوگا کوئی، امید بر آئی جس کی
اپنا مطلب تو نہ اس چرخِ کہن سے نکلا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

صدمہ = دھکا لگنا، کٹنا، چوٹ کھانا، مصیبت اٹھانا
جنبش = ہلنا حریف = مدِ مقابل
دم = سانس عیسیٰ علیہ السلام = نام ہے اس نبی کا

جس کا معجزہ بیمار کو اچھا کرنا اور مردے کو زندہ کرنا تھا۔

اس شعر کے معنی میں کم فہم آدمی دھوکا کھا جائیگا، کیوں کہ مسیح کا تعلق مردے جلانے سے زیادہ مشہور ہے۔ پس جب غالب مردہ تھا، تو مردے کا مرنا چہ معنی دارد! ایک جنبشِ لب سے مراد اگر تم ہے جو مردے کے لیے زیادہ ترموزوں ہے اور صدمۂ بے روح ناممکن کیوں کہ حس وادراک متعلق بروح ہے، تو جنبشِ لب سے صدمہ پہنچا کیسا! لہٰذا میرے نزدیک مرزا صاحب نے آپ کو مردہ نہیں کہا بلکہ بیمار ٹھیرایا ہے۔ اب معنی میں کوئی دقت نہیں۔ مراد یہ ہے کہ حضرت عیسٰی مجھے اچھا کرنے آئے تھے۔ اس وقت گو میں زندہ تھا، لیکن ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ حضرت مسیح کے لب ہلانے ہی دم نکل گیا، اور میں ان کے دمِ اعجاز کا حریف نہ ہوا۔ مدِمقابل کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ طرفِ ثانی کے سامنے ڈٹا رہے۔ میں ان کی اور باتوں کو کیوں کر جیتتا اور ان کے مقابلے میں کیا مقاومت کرتا! پہلے ہی حملے میں دم فنا ہوگیا۔ مراد یہ ہے کہ بیمارِ عشق حضرت مسیح سے اچھا نہ ہوسکا، بلکہ اس بیچارے کا الٹا کام تمام ہوگیا۔

ماحصل : مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۱۰

ستائشگر ہے زاہد اس قدر، جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے، ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ستائشگر = تعریف کرنے والا

زاہد = خدا کے خوف سے دنیا کی لذتوں کو ترک کرنے والا

باغِ رضواں = اللہ کی رضا اور خوشنودی کا باغ یا وہ باغ جس کا رضوان

نام ایک دربان ہے۔

گلدستہ = پھولوں کا گچھا، جس کو مالی نے باندھا ہو

طاقِ نسیاں = وہ طاق جہاں کوئی چیز رکھ کر بھول گئے ہوں۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں اور بڑی دور کی لیتے ہیں۔ یعنی زاہد ترکِ لذات میں عاشقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھیے جنت کی نعمتیں دیکھ دیکھ کر حضرت زاہد کیسے بہشت کے بھاٹ بنے ہوتے ہیں۔ جنت کی بہار کا گلدستہ قدرت نے بنا کر ہم کو بھی دیا تھا، لیکن عشق کی نعمت لے کر ہم ایسے بے پروا ہوئے کہ وہ گلدستہ کہیں طاق میں رکھ کر بھول گئے۔ اور یاد نہیں آتا کہ جنت کیا چیز تھی اور کہاں جاتی رہی۔ ایک حضرت زاہد ہیں کہ دن رات وہی فکر ہے۔

ماحصل : نہیں کچھ اشتہا باقی بہت غم کھا کے آیا ہوں
کہوں گا اہلِ جنت سے کہ نعمت اپنی رہنے دو

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

بیداد = ستم

کاوش = کھودنا، کسی کو رنج دینا، کسی کو دکھ دینا، کسی سے حسد رکھنا۔

مژگان = پلکیں (مژہ کی جمع)

تسبیح = سمرن مرجان = مونگا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مژگاں کی کاوشوں کا بیان کرنا قوتِ لسانی کے باہر ہے۔ ان چبھتی ہوئی نوکوں نے سارا سینہ لہولہان کر دیا ہے۔ خون کا جو قطرہ نکلتا ہے، وہ دانۂ تسبیحِ مرجاں کی طرح ہی ذکر کرتا ہے۔

خون کے قطرے کو مرجان کے دانے سے ، سرخی کے سبب سے تشبیہ دی ہے ۔ مراد یہ ہے کہ آنکھ سے جو کاوشِ مژگاں کے سبب اشکِ خوں جاری ہوا اس کا ہر قطرہ ۔ ایک تسبیح ہے جس پر مژگان کی بیشمار جفاؤں کا شمار ہوتا ہے ۔ اشک نہیں تھمتے ، اس لیے کاوشِ مژگاں کا ختم ہونا چہ معنی !

ماحصل : اٹھائیں آپ نے پلکیں ، کلیجے ہو گئے چھلنی
یہ کیا چشمِ خماری تھی ، یہ کیا اندازِ مژگاں تھا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

آئینہ خانہ = شیش محل یا آئینے کا گھر
آئینہ = آئینہ ، پرتو = جھلک
شبنمستاں = شبنم کی جگہ جہاں بہت سی اوس پڑی ہوئی ہو ۔
شبنم = رات کی تری ، درختوں پر رات کو جو اوس پڑتی ہے اسے شبنم کہتے ہیں ،
ستاں = کثرت نسبت ، جیسے گلستاں وغیرہ

معشوق سے خطاب ہے کہ تیرے جلوے کی گرمی نے آئینہ کا وہ حال کیا جو خورشید کے نور سے شبنم کا رنگ ہوتا ہے ۔ انتہا سے فروغِ حسن کی تعریف ہے کہ پارہ آگ پر نہیں ٹھہرتا ۔ آئینہ پر قلعی چڑھائی جاتی ہے جس سے چہرے کا عکس رک کر صورت پذیر ہوتا ہے اور جب آفتاب طالع ہوتا ہے ، شبنم اڑ جاتی ہے ۔ مراد یہ ہے کہ فروغِ حسنِ معشوق سے آئینہ پانی پانی ہو گیا ، ساری قلعی کھل گئی ۔

ماحصل : فروغِ حسن نے مٹی کر دی سیماب کی قلعی
تری ہمتا گدازی پر غرض آئینہ حیراں تھا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا

تعمیر = بنائی مضمر = پوشیدہ
ہیولیٰ = قبول کرنے والی چیز، صورت کا محل
برقِ خرمن = ڈھیر جلانے والی بجلی
خونِ گرم = جوشِ محبت دہقاں = کسان

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میری آبادی میں بربادی پوشیدہ ہے۔ اس طرح جب کسی کام کرنے کی گرمجوشی میرے رگ وپے میں پیدا ہوتی ہے، اس سے میری کاربراری کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ گویا ایک دہقان کی سرگرمی خرمن اندازی کے لیے اس قدر مضرت پیدا کرتی ہے کہ اس سے خرمن کے حق میں برق کا ساضرر پہنچتا ہے۔ بدیں وجہ کامیابی کا سرمایہ جل جاتا ہے اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ انتہائے شومیِ طالع کا بیان ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں، وہ کام میری ہی ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔

ماحصل: ایسی بگڑی ہوئی قسمت ہے کہ میں نام اپنا
لکھتا کاغذ پہ ہوں تو حرف بگڑ جاتے ہیں

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

ویراں = اجاڑ تماشا کر = دیکھ (یہ لفظ تماشا اصل میں مشی سے نکلا ہے۔ مشی عربی میں چلنے کو کہتے ہیں۔ فارسی والوں نے دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے)

مدار = ہر پھر کر دیہ میں آنا

کثرتِ ویرانی کا بیان ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بدنصیبی، مفلسی، یا جوشِ جنوں شوریدہ سری میں آگیا اور میرا گھر ایسا اجڑ گیا اور ویرانہ ہوگیا کہ اس میں ہر طرف جنگلوں کی طرح سبزہ اُگا ہے اور ایسی کثرت ہے کہ میرے دربان کی تنخواہ گھاس کھودنے سے نکلتی ہے۔ اس سے تہی دستی کا بھی رنگ ظاہر ہے۔ مرزا صاحب دربان کی تنخواہ نہیں دے سکتے لیکن ادائے تنخواہ ضروری ہے۔ اس لیے خانہ اس قدر ویران ہے، گھاس کھودنا اور بیچنا اس کی روزی کا باعث ہے۔ جہاں کثرتِ ویرانی کا اظہار ہے، وہاں کثرتِ مفلسی کا بھی ذکر ہے۔ واقعی دلّی کے ان مکانوں پر جن کے مکیں ان کو تنہا چھوڑ گئے ہیں، یہی شعر جچتا ہے۔

ماحصل: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

خموشی = چپ رہنا — خوں گشتہ = جن کا خون ہو چکا ہو

چراغ مردہ = بجھا ہوا چراغ — گورِ غریباں = قبرستان

انتہائی یاس و حرماں کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہجوم ناامیدی سے مہرِ سکوت لگی ہوئی ہے۔ کیوں کہ امید کا باب بالکل مسدود ہے، اس لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں۔ بس خموشی بیان کرتے ہیں۔ اس شخص کی کسی سے آرزو نکل نہ سکی۔ کسی سے کاربراری کی امید نہیں اس لیے بات کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ تو وہ سینہ جس میں شہید کی آرزوئیں مدفون ہیں، میرا گورِ غریباں ہے۔ میں ان پر مایوس خاموشی اور بے زبانی کے سبب سے بجھے ہوئے

چراغ کا قائم مقام ہوں۔

ماحصل: وہ بھی ہوگا کوئی ، امید برآئی جس کی
اپنا مطلب تو نہ اس چرخِ کہن سے نکلا

بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

تبسم = مسکرانا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس آکر معشوق کا خندہ پیشانی ہونا، ہماری خوبیِ قسمت کے خلاف ہے۔ آج یہ خواب میں آنا اور بے وجہ مسکرانا اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارے لیے ایذا دہی کا کوئی سامان پورا پورا تیار ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کسی رقیب کی بغل میں آرام فرما رہے ہیں اور ہمارے اوپر بطور تمسخر و طعنہ زنی ہنسی آ رہی ہے۔ منظور یہ ہے کہ ہمیں خواب میں بھی آرام نہ آئے

ماحصل: خود رقیبوں سے وفا کرتے ہیں
میرے رونے پہ ہنسا کرتے ہیں

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہنوز = اب تک   پرتو = جھلک
افسردہ = ٹھٹھرا ہوا   حجرہ = کوٹھری
زنداں = قید خانہ

طوالِ فراق کا رونا ہے۔ یعنی وصال کی صورت دیکھے ہوئے برسوں ہوئے اور

فراق کا عالم پیشِ نظر ہے۔ ایسی طولانی جدائی سے معشوق اور اس کی یاد کا نقش، چاہیے تھا، مٹ جاتا۔ مگر میری حسنِ وفاداری نے اس کی پوری پوری نگہبانی کی اور اس کو صفحۂ اوّل سے محو و سہو نہ ہونے دیا۔ اب اس کی ایسی مثال ہے کہ قید خانے کا وہ حجرہ کہ جس میں حضرت یوسف قید تھے اور اس سے چھوٹے ہوئے مدّتیں ہوئیں، گویا میرا دل ہے، یعنی جس طرح اس حجرے کو دیکھ کر لوگوں کو حضرت یوسف کا خیال پیدا ہوگا اس طرح میرے دل میں معشوق کا خیال باقی ہے۔

ماحصل: تم مجھے بھول گئے ہو، صاحب!
ہم تمہیں یاد کیا کرتے ہیں

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

سرشک = آنسو آلودہ = بھرا ہوا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق ایسا سنگدل ہے کہ وہ کسی کے دکھ درد پر نہیں پسیجتا، چہ جائے کہ کسی کی حالتِ زار دیکھ کر اس کی آنکھ سے آنسو نکلے۔ کیوں کہ رونا دلیلِ رحم ہے اور رحمدلی سے معشوق کو کیا تعلق! اس لیے ثابت ہوا کہ وہ ایسے حوادث اور ایسی قیامتیں ہوں گی، جو انسان کے وہم و خیال سے باہر ہیں، ورنہ اس کی پلک تک آنسو نہ آتا اور وہ کسی پر رحم نہ کھاتا۔ لہو کا پانی ہونا انتہائی مصیبت پر بولا جاتا ہے۔ سرشک اور پانی سے مناسبتِ شعری ہے۔ اس شعر کی روح یہ ہے کہ معشوق کو آبدیدہ دیکھ کر کوئی نادان رحمدلی کے گمان سے خوش نہ ہو اور سرابِ مہر و وفا کا دھوکا نہ کھائے۔

ماحصل : ستم کرے ہے لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ = پتا　　　شیرازہ = کتاب سینے کا ڈورہ

اجزا = جمع ہے جزو کی

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جس طرح کتاب کے جزو شیرازہ سے باندھتے ہیں، اسی طرح ہستی کے پریشان دفتر کو قدرت کے صحیفے بند نے عدم سے وابستہ کیا۔ ایک عرب کی مثل ہے :

الوجود بین العدمین ⁘ ہستی دو نیستیوں کے درمیان ہے

اول عدم، دوسرے فنا۔ پس جس ہستی کے پیچھے دو نیستیاں پڑی ہوں، اس کی کیا کامیابی ہے اور اس پر بھروسہ کرلینا کیسی نادانی کی بات ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ہم ان انجام بینوں میں ہیں، جو ہر ایک امر کی غایت اور انتہائے نتیجہ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور دنیائے بے ثبات کا فریب نہیں کھاتے۔

ماحصل : ترکِ دنیا میں سوچ کیا، ناسخ!
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

۱۱

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار، ہے نقشِ قدم میرا

یک بیاباں = ایک جنگل

واماندگی = رہ جانا، بے بسی / بیماری، قافلے سے بچھڑ جانا

ذوق = لذت   بلبلہ = موجہ، لہر

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرا ذوقِ دشت ہزارہا بیاباں کی خاک چھانتا چاہتا ہے۔ اگر میں واماندگی سے ایک ہی بیاباں میں رہ گیا، تو میری صحرا نوردی کا ذوق شوق کم نہ ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ جس طرح موج کی ٹھوکر سے بلبلے ٹوٹ جاتے ہیں، اسی طرح میری تیز رفتاری سے، میرے نقشِ قدم مٹ جاتے ہیں۔ درحال یہ کہ نقشِ قدم ٹھہرنے نہیں پاتا، تو میرا پائے وحشت کیوں کر ٹھہر سکتا ہے۔ پس اگر ناتوانی ایک ہی جنگل میں میری رفتارِ جنوں کا دور کرے، تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرا ارادہ اور عشق و جنوں کی اولوالعزمیاں گھٹ گئیں۔ مراد یہ ہے کہ صحرائے جنوں میں میری تیز روی سے میرے پاؤں کا نشان پڑ نہیں سکتا، پس ایسا تیز رفتار واماندگی سے پست ہمت کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ دفورِ دیوانگی کی ضعف بیماری سے میں ایک ہی بیاباں میں پڑا پھرتا ہوں، لیکن عشق کے دیوانوں سے اب بھی گھٹا ہوا نہیں ہوں۔

ماحصل : چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوری منزل

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

بیدماغی = طبیعت کا الجھنا، کسی شئی سے دماغ کا پریشان ہونا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ کثرتِ حوادث اور انقلاب روزگار سے طبیعت ایسا بیٹھا گئی کہ کسی سامانِ تفریح سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ پہلے سیر باغ و

راغ اڑا کرتی تھی، چمنستانوں میں بہاریں لوٹتے تھے، بوستانوں میں عیش و عشرت کے جلسے رہتے تھے۔ مگر زمانے کا رنگ ایسا بدلا کہ وہ ہم نہ رہے، وہ دل و داغ نہ رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ عیش و طرب کے نام سے بھی بخار چڑھتا ہے۔ اگر چمن کے پھولوں کی خوشبو بھی آجاتی ہے تو طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔

ماحصل : کس کا گیسو، کس کی کاکل، کس کا طرہ، کس کی زلف
سب بلائیں ہو گئیں، جب دل پریشاں ہو گیا

۱۲

بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ظرف = پیٹ، برتن ساقی = شراب پلانے والا
خمار = نشہ کی گھمیر خمیازہ = انگڑائی
ساحل = کنارہ

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ گو مطلوب کی دولت وسیع ہے، لیکن میری طلب بھی ادھوری نہیں ہے۔ اے ساقی، اے مبدءِ فیاض، اے سرچشمۂ فیض! اگر تو شراب کا دریا ہے، تو میں ساحل کی آغوش ہوں۔ انگڑائیاں اور جمہائیاں انسانوں کو اس وقت آتی ہیں، جب کسی شئے کی طلب ہوتی ہے۔ حقہ کش، افیمچی، شرابی، جو اپنا مقصود نہیں پاتے تو ان سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جس طرح دریا کو ساحل اپنے ظرف میں کھپا لیتا ہے، اس واسطے ساقی جس قدر شراب دے گا، میں اسے پچا لوں گا اور چھلک نہ جاؤں گا۔ اصل مراد یہ ہے کہ میں وہ کم ظرف نہیں ہوں کہ زیادہ نعمتوں سے پھول جاؤں اور بہک کر ساقی سے انحراف کر دوں۔

ماحصل : وہ ہیں کم ظرف جو مے پی کے بہکنے والے
ہم کہاں صورتِ ساغر ہیں چھلکنے والے

۱۳

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محرم = رازدار، بھیدی نوا = راگ

حجاب = پردہ ساز = باجا

مراد یہ ہے کہ خدا کا ظہور ہر ایک ذرے سے ہوتا ہے اور ہر ذرۂ حسنِ حقیقی پر ایک پردہ ہے ۔ لیکن وہ چھپانے والا پردہ نہیں ہے، بلکہ باجے کا سا پردہ ہے ۔ جس طرح راگ، باجے کے پردے سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح حجاب کے پردوں سے حقیقت کا حسن جھلکتا ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ تو وہ آنکھ نہیں رکھتا کہ پردے کے پرے سے جھلکتا ہوا حسن دکھائی دے ۔ لہٰذا ظہورِ حق پر کوئی الزام نہیں آسکتا ۔ جو کچھ ہے تیری ہی کوتاہیِ نظر ہے ۔

ماحصل : پردۂ غفلت مری آنکھوں سے اٹھ جاتا نہیں
سامنے وہ مہرِ وش ہے اور نظر آتا نہیں

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگِ شکستہ = ٹوٹا ہوا رنگ، یعنی اڑا ہوا رنگ، چہرہ فق، زردیٔ رخ ۔
شگفتن = کھلنا پھولوں کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عاشق کا اڑا ہوا رنگ، معشوق کے دیکھنے کے لیے نظارہ کے بہار کی صبح کا وقت ہے ۔ یعنی ناز و ادا کے پھول اسی وقت

کھلتے ہیں۔ کیوں کہ جب معشوق عاشق کو اپنے غم میں کھلا ہوا زرد رُو دیکھے گا، تو حسن اپنی خوبی پر نازاں ہوگا اور معشوق طرح طرح کے ناز اور رنگ برنگ ادائیں عاشق کے سامنے رکھے گا، جس سے اس کا عشق دوچنداں ہوجائے گا۔

ماحصل : اسیرِ عشق بت حیلہ ساز کرتے ہیں
نیازمندوں سے کیا کیا یہ ناز کرتے ہیں

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے میں تیری لمبی لمبی پلکوں کا دکھ رکھتا ہوں اس سے تجھ کو میرا دکھ درد دیکھنا لازم تھا۔ مگر اس کے بالعکس تو محفل میں رقیبِ روسیاہ پر، جو میرا دشمن ہے، تیز تیز نظریں ڈال رہا ہے، جس سے کمالِ محبت اور پیار پایا جاتا ہے۔ یہ ہمارا حق تھا۔ حق مستحق کو ملنا چاہیے۔ تیرے مزاج میں الٹی بات یہ ہے کہ ہمارا حق دشمن کو دیتا ہے، جو غیر مستحق ہے۔

ماحصل : جاں باز مومن اس نے دیا غیر کو خطاب
ہم جان سے بھی گزرے، یہ نام اور کا ہوا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

صرفہ = فائدہ، بخل ضبط = روکنا
طعمہ = کھاجا، خوراک، کھانے کی چیز، لقمہ
نفس = آہ جاں گداز = جان کی گھلانے والی چیز

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں جو ضبطِ آہ کئے بیٹھا ہوں، اس میں میرا کچھ فائدہ ہے۔ ورنہ میں تو غمِ عشق کی بدولت ایسا ناتواں اور نقیہہ ہوں کہ اگر ایک مرتبہ آہ کھینچوں تو میرا دم فنا ہو جائے۔

ماحصل: دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمارِ غمِ ہجر میں کیا رکھا ہے

ہیں، بس کہ جوشِ بادہ سے، شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اس شعر میں کوئی غزلیت نہیں ہے۔ فقط موسم کی مستی اور بزمِ عشرت کی اچھل کود کا بیان ہے۔ کیوں کہ بازی گر ہنگامِ بازی اپنے سر کو بار بار جنبش کرتا ہے۔ اس لیے گوشۂ بساط کو سرِ بازی گر سے تشبیہہ دی ہے۔ کیوں کہ شراب کے شیشے ہر گوشہ پر جوشِ مستی سے ہلا کرتے ہیں۔ وفورِ نشاط کے باب میں انتہائی مبالغہ ہے۔ یعنی عالم میں ایسی خوشی بھری ہوئی ہے کہ جمادات پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ اگر اس سے غرض نہ رکھیں کہ شیشے فرش کے تلے ہیں یا اوپر، تو جس بازی میں بازیگر اطفالِ تماشائی کے سروں کو چادر کے تلے بٹھا کر جنبش دیتا ہے، تو اچھلتے ہوئے گوشۂ بساط کو ان سروں کی مناسب تشبیہہ ہوگی۔

ماحصل: پھول کھلیں، جب بلبل چہکے
دل بھی اچھلیں، رہ رہ کے

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے دل کا سودا ہنوز کم نہیں ہوا اور غم کی خلش

اب تک نہیں مٹی، جیسے کہ ابتدائے عشق میں دل کو کاوشِ غم سے مزا آتا تھا۔ اگرچہ اب ہاتھ اور ناخن کثرتِ استعمال سے بیکار ہو گئے، لیکن دل کی لذتِ شوق ابھی تک (ہنوز) کام میں ہے اور ناخنِ جنوں سے کہہ رہی ہے کہ اپنی کوشش میں کمی نہ کر اور میری کاوش کا قرض جلد ادا کر۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح ادائے قرض انسان پر واجب ہوتا ہے، اسی طرح تقاضائے جنون محبت نے کاوشِ دل کو ناخنِ گرہ کشا پر واجب سمجھ رکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دیوانگی ہوگی۔

ماحصل : پینے میں مزا ہے نہ تو کھانے میں مزا ہے
جو حضرتِ کھجلی کے کھجانے میں مزا ہے

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ!
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

تاراج = لٹا ہوا — کاوش = کھودنا
دفینہ = گڑا ہوا خزانہ

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سینے میں کیسے کیسے قدسی خیالات اور علوم کے خزانے پوشیدہ تھے، لیکن افسوس ہے کہ غمِ ہجر نے سب لٹوا کر دیے اور دل و جگر کو کھود کھود کر جو کچھ جواہر دفن تھے سب نکال لیے۔ یہ ایک سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا مدامی غم، کسی اور شئے کو یاد نہیں رہنے دیتا۔ گویا عشق و عاشقی کے برے انجاموں کا ذکر ہے۔

ماحصل : اگر صد باب علم از بر بخوانی
چو آشفتی، الف تا یے ندانی

اس شرح کے متعلق قیاس آرائیاں :

ماہنامہ شاعر بمبئی کے "غالب نمبر" میں جناب نادم سیتاپوری کا ایک مضمون بعنوان "غالب کے کلام میں تحریف و تصرف" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ص : ۱۲۷ اور ۱۲۸ پر بیان میرٹھی اور شوکت میرٹھی کی شرحِ دیوانِ غالب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بیان میرٹھی کی اس شرح کے متعلق چند اہلِ قلم نے محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اصل حقیقت کا علم نہ ہو سکا۔ یہاں ہم نادم سیتاپوری کے اس مضمون کے چند اہم اقتباس نقل کرتے ہیں۔ وہ ابتدا میں غالب کے کلام میں تحریف و تصرف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "غالب کے کلام میں تحریف و تصرف کا آغاز شوکت میرٹھی کی حلِ کلیاتِ غالب سے ہوا جو غالب کی باضابطہ شرحوں میں دوسری شرح کہی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل نظم طباطبائی کی شرح شائع ہو چکی تھی۔ لیکن جہاں تک کلام غالب کی شرح کاری کا تعلق ہے اس کی ابتدا طباطبائی سے بہت پہلے سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی (وفات : مارچ ۱۹۰۰ء) کر چکے تھے۔

اتنا لکھنے کے بعد نادم سیتاپوری اپنے بیان کے ثبوت میں ماہنامہ العصر لکھنؤ اگست ستمبر ۱۹۱۳ء کے ایک ادارتی نوٹ کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں :

> "رسالہ لسان الملک میرٹھ (اجرا ۱۸۸۷ء) میں ایک عرصہ تک حل المطالب کے نام سے ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوانِ غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شائع نہیں ہوئی ہے ورنہ ادب

اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتا"

اس کے بعد مولانا سید عبدالرزاق راشد مرحوم حیدرآبادی کا یہ بیان اصلاحاتِ غالب (مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۶۶ء) کے حوالے سے درج کرتے ہیں:

"بیان رسالہ لسان الملک نکالتے تھے۔ اشعارِ غالب کا حل چیدہ چیدہ اس رسالے میں شائع ہوتا تھا۔ شرح پوری ہوئی یا ادھوری اس کا علم نہ ہو سکا" (ص: ۵۷)

ان اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد نادم سیتاپوری نے بیان کی شرح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"بیان کی یہ شرح غالبؔ نامکمل ہی رہی۔ اس کے کچھ سرسری خدوخال کا پتہ چل سکا جن کا ذکر میں نے اپنے مضمون "دیوان غالب کی ابتدائی شرحیں" مطبوعہ ماہنامہ صبح نو پٹنہ، ستمبر ۱۹۶۲ء میں کر دیا ہے۔"

شرح کے متعلق اظہارِ خیال کرنے کے فوراً بعد نادم سیتاپوری، بیان میرٹھی اور شوکت میرٹھی کے مابین تعلقات پر اس طرح خامہ فرسائی کرتے ہیں:

اگرچہ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا لیکن قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں جب شوکت رام پور ترکِ سکونت کر کے میرٹھ پہنچے تو انھیں میرٹھ کا ایک رچا بسا ادبی ماحول مل گیا اور وہ سید محمد مرتضیٰ بیان کے ساتھ مل جل کر ادبی سرگرمیوں میں کھو گئے۔ اخبار طوطی ہند میرٹھ اور رسالہ لسان الملک کے فائل کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب ہو چکے ہیں اس لئے قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا

کہ شوکت کا براہِ راست تعلق ان کے ادارۂ تحریر سے تھا۔
مگر ماضی کے ادبی سوتوں میں جب طوطی ہند، ریاض الاخبار
اور اودھ پنچ کا نام لیا جاتا ہے تو شوکت میرٹھی کا ذکر ضرور
آجاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں سے ایک ایسی شخصیت
جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا ہلکا سا عکس مولانا راشد
مرحوم کے ان الفاظ میں موجود ہے۔
"شرح غالب مصنفہ سید احمد حسن شوکت میرٹھی جو اپنے آپ کو
مجدد السنۂ شرقیہ لکھا کرتے تھے کسی رسالے کے ایڈیٹر
تھے۔ اس زمانے کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کے
بلند بانگ دعوے شائع ہوئے تھے کہ ان کے مانند کوئی
شخص عرفی، خاقانی اور غالب کے اشعار کو نہیں سمجھ
سکتا (اصلاحاتِ غالب، ص: ۵۷)
وہ آگے لکھتے ہیں:
"بیان آخری عمر میں مراق اور مالی خولیا کا شکار ہو کر ذہنی
توازن کھو بیٹھے تھے۔ جب تک سورج کی شعاعیں رہتیں
وہ اندھیرے میں چھپے رہتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شوکت
ان کے مقربین خاص میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اور حل
المطالب کا جو کام بیان نے ادھورا چھوڑ دیا تھا" حل کلیاتِ
کی شکل میں انھیں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور
"حل کلیات غالب" جو بیان میرٹھی کی زندگی میں
خود شوکت نے اپنے شوکت المطابع میرٹھ سے اکتوبر ۱۸۹۹ء
میں شائع کیا تھا اس کا ابتدائی تصور بیان میرٹھی کی فکرِ رسا

کارہینِ منت ہے "

اس کے بعد وہ اس بیان کی اس طرح تردید کرتے ہیں :

" مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے بیان میرٹھی کی شرح سے دور کا علاقہ نہ تھا بلکہ اس عہد کے علمی وادبی ماحول میں اسے شرح کا درجہ بھی نہیں دیا گیا.........."

" شوکت اور بیان میرٹھی میں بعد المشرقین تھا۔ یہ اپنے زعمِ خود ستائی میں کسی کی ہجو سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے (وہ (بیان) غالب کے پرستاروں میں تھے۔ غالب کے رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کے بعض اشعار کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو اپنے اس معنوی شاگرد کو سینے سے لگا لیتے "

مجھے اس سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ مجھ کو تلاش وتحقیق کے بعد جو کچھ ملا ہے اس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بیان میرٹھی نے شوکت میرٹھی کی شرح کے جواب میں شرح لکھنا شروع کی تھی جس کی تفصیل ابتدا میں بیان کی جا چکی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ شرح صرف تیرہ غزلوں تک ہی پہنچی تھی کہ بیان کا ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء کو اچانک انتقال ہو گیا۔ چوں کہ بیان یہ شرح اپنے پرچے لسان الملک کے لیے قسط وار لکھ رہے تھے اس لیے اس سے آگے کی تلاش فضول ہے۔

حواشی :

۱- مفصل حالات کے لیے راقم کی تصنیف " بیان میرٹھی حیات و شاعری" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) ملاحظہ کیجیے۔

۲- خمخانۂ جاوید (حصہ اوّل) از لالہ سری رام، ص: ۶۲۴

۳- بیان نے یہ غزل غالب کی اس غزل سے متاثر ہو کر کہی ہے:

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

۴- اس زمین میں غالب کا مطلع یہ ہے:

ملتی ہے خوئے یار سے نار، التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

۵- غالب نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں۔ دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

۶- اس زمین میں غالب کا مطلع ہے:

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

۷- یادگارِ غالب مرتبہ الطاف حسین حالی، ناشر چمن بکڈپو، دہلی، ص: ۴۲، ۴۴

۸- ماہنامہ جلوۂ یار، میرٹھ، اپریل ۱۹۲۱ء، ص: ۷

۹- ماہنامہ لسان الملک، میرٹھ، جنوری ۱۸۹۳ء، ص: ۱۱، ۱۲

۱۰- ماہنامہ لسان الملک، میرٹھ، مئی ۱۸۹۳ء، ص: ۱۳ تا ۱۵

۱۱۔ ثبوت کے لیے خط نمبر ۵ ملاحظہ کیجئے، جس میں غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کا قطعۂ تاریخ بھی ہے۔

۱۲۔ سید مہدی علی، بیان کے حقیقی ماموں تھے۔ اس خط میں "دہی جو درائے جالون ہے" ۔ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت سید مہدی علی جالون میں مقیم تھے ویسے وہ بسلسلۂ ملازمت مختلف مقامات پر رہے۔ ان کا ۱۹۰۵ میں گورکھپور میں انتقال ہوا۔ ڈپٹی کلکٹر کے مرتبہ تک پہنچے تھے۔

۱۳۔ سید اصغر حسین، بیان کے بڑے بھائی تھے۔ بیان سے چھوٹے چھ بھائی اور تھے جن کے نام یہ ہیں: سید یعسوب الدین، سید سلطان الحق (ف: ۱۹۰۷ء)، سید ابوالحسن، سید محمد، سید حسین شرف، سید آغا علی آغا۔

ان میں سید محمد کا انتقال عین جوانی میں والد کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ سید اصغر حسین عدالتِ میرٹھ میں ہیڈ کلرک تھے۔ سید یعسوب الدین ضلع جالون میں امینِ کونج کے عہدے پر فائز ہوتے۔ سید حسین شرف علیگڑھ میں نائب تحصیلدار تھے۔ سید سلطان الحق دفتر کلکٹری گورکھپور میں سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ وہ اپنے حقیقی ماموں سید مہدی علی کے داماد تھے۔ ان کا ۱۹۰۷ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ سید ضیاء الاسلام عیاں میرٹھی انھی کے بیٹے تھے۔

۱۴۔ عنایت علی اثر، بیان کے چہیتے شاگرد تھے۔ ملازمت پیشہ تھے اس سلسلے میں وہ کئی جگہ مقیم رہے۔ ان کا کلام لسان الملک میں شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ ولایت علی جادو، عنایت علی اثر کے بھائی تھے۔ یہ بھی بیان کے چہیتے

شاگرد تھے۔ ملازمت پیشہ تھے۔ اس سلسلے میں کئی جگہ مقیم رہے۔ ان کا کلام لسان الملک میں شائع ہوا ہے۔

۱۶۔ نادر علی خاں اپنی کتاب ہندوستانی پریس (۱۵۵۶ء تا ۱۹۰۰ء) مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ (۱۹۹۰ء) میں مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ کا تذکرہ کرتے ہوئے ص: ۳۷۶ پر لکھتے ہیں:

"مالک سید محمد مرتضیٰ (خاں) بیان یزدانی، کاتب شوکت علی، لوح نویس قائم علی، اجرائے یکم جنوری ۱۸۸۱ء، آزاد لائبریری میں ۱۸۸۹ء کی مطبوعہ کتاب محفوظ ہے۔"

اسی پریس سے بیان میرٹھی نے ۱۸۸۱ء میں "طوطیِ ہند" نکالا تھا۔ جناب امداد صابری کی تحقیق کے مطابق:

"یہ ہفتہ وار اخبار میرٹھ سے ۱۸۸۱ء کو ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس کے بانی سید محمد مرتضیٰ صاحب بیان یزدانی اور مہتمم منشی ولایت علی خان جادو مختار عام مالک مطبع حدیقۃ العلوم، ایڈیٹر سید محمد حسین صاحب روحانی تھے۔ بعد میں اس کے مالک سید سجاد حسین ریحانی ہو گئے تھے۔ افسوس اس اخبار کا ایک پرچہ بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس کی زیارت کرنے کی بے حد کوشش کی گئی" (تاریخ صحافتِ اردو حصہ سوم مطبوعہ جدید پرنٹنگ پریس دہلی، ص: ۲۰۷)

"طوطیِ ہند" کا "میرٹھ پنچ" کے عنوان سے "اودھ پنچ" کے مقابلہ میں ہر ہفتہ ایک ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے متعلق جناب امداد صابری

یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں :

"میرٹھ سے یہ ہفتہ وار اخبار چار صفحات پر ۱۸۸۰ء کو شائع ہوا۔
اس کے جاری ہونے کا جمعہ کا دن تھا۔ مالک مولوی سید
محمد مرتضیٰ صاحب بیان یزدانی، مہتمم منشی ولایت علی
جادو، ایڈیٹر سید کرار حسین صاحب روحانی تھے۔ سالانہ
چندہ ڈیڑھ روپیہ تھا۔ یہ طوطیِ ہند کا ضمیمہ تھا"
(تاریخ صحافت اردو، حصہ سوم، ص : ۲۰۶)

بیان نے اس پرچے کو بعد میں فروخت کر دیا تھا۔ ان کے چند خطوط سے جو اس کتاب میں شامل ہیں یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۸۳ء کے اواخر یا ۱۸۸۴ء کے اوائل کا ہے۔ یوں یہ ہفتہ وار تقریباً تین سال ان کی ملکیت و نگرانی میں رہا۔ اس تین سال کے عرصہ میں اس نے زبردست ادبی معرکہ آرائی کی اور علمی و ادبی حلقوں میں کافی دھوم مچائی۔

میرے خیال سے یہ پرچہ فروخت کر دینے کا اصل سبب ان کی نفسیاتی اور ذہنی بیماری تھی جس کا وہ بعد کو مسلسل شکار رہے۔ انھوں نے یہ پرچہ اپنے حقیقی ماموں سید مہدی علی کے کہنے پر بیچا تھا جیسا کہ خط نمبر ۱۲ سے ظاہر ہے۔
یہ پرچہ فروخت کر دینے کے بعد بیان نیا پرچہ نکالنے کے لئے خطوط کی روشنی میں بہت ہی مضطرب و بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ آرزو تین سال بعد پوری ہوئی۔ انھوں نے ۱۰ جون ۱۸۸۷ء کو ایک ادبی ماہنامہ "لسان الملک" نکالا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔

۱۷۔ سید سجاد حسین ریحانی، زتانی میرٹھی کے بڑے بیٹے تھے۔

۱۸۔ زتانی میرٹھی کی سسرال رسول پور، دھولڑی (ضلع میرٹھ) میں تھی۔
ان کے سسر کا نام سید نواب علی تھا۔

۱۹۔ مولوی حامد حسین لکھنو کے ایک جید عالم تھے۔ ان سے ذرّقانی کے گہرے مراسم تھے۔ جناب علی جواد زیدی نے ان دونوں کے تعلقات پر اپنے مضمون مطبوعہ نکر دریاض میں روشنی ڈالی ہے۔ بیان میرٹھی بھی ان کے بے حد عقیدت مند تھے۔ ان کی موت سے متاثر ہو کر بیان نے ایک طویل پُر اثر مرثیہ بھی لکھا ہے۔

۲۰۔ اس کے ایڈیٹر مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی تھے۔ یہ پرچہ ۲۰ جنوری ۱۸۸۳ء کو میرٹھ سے جاری ہوا۔ شوکت المطابع میں چھپتا تھا۔
(تاریخ صحافت اردو حصہ سوم، ص : ۲۵۵)

۲۱۔ یہ دہی منشی ممتاز علی خان ہیں جن سے غالب کے اچھے مراسم تھے۔ ان کا ذکر جناب مالک رام نے ذکر غالب (مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ستمبر ۱۹۶۴ء) کے صفحہ نمبر ۱۵۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹ پر کیا ہے۔ انھی منشی ممتاز علی خان کو سب سے پہلے غالب کے اردو خطوط جمع کرنے کا خیال ہوا۔ انھوں نے ہی مختلف ذرائع سے خطوطِ غالب جمع کر کے اس کا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے مطبع مجتبائی میرٹھ سے اول بار ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو چھپوایا تھا۔

۲۲۔ یہ خط امیر مینائی کے نام معلوم ہوتا ہے۔ امیر مینائی نے بیان کی وفات سے متاثر ہو کر اس مصرع سے تاریخ نکالی ہے :

"یزداں بخشد جناب یزدانی را" ۱۳۱۷ ہجری

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کے تعلقات امیر مینائی سے تھے۔

۲۳۔ یہ اشارہ غالباً ریاض خیرآبادی کی طرف ہے جوں کہ جناب نادم سیتاپوری کے بیان کے مطابق :

"ریاض، آزاد (محمد نذیر) اور محمد مرتضیٰ بیان میرٹھی کا

اتحادِ ثلاثہ ایک خاموش بساطِ شعر و ادب بنا ہوا تھا۔ ان تینوں
کے درمیان ایک مسلسل روزنامچہ گردش کناں رہتا جس
میں نجی زندگی کے علاوہ ادبی اور سماجی زندگی کے چٹخارے
بھی تھے۔ فل اسکیپ سائز کا یہ روزنامچہ برابر ان تینوں
کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا اور اس میں یہ تینوں اضافہ
کرتے رہتے تھے۔ خانگی مصروفیات اور نجی زندگی کے علاوہ
اس ڈائری میں تازہ افکار بھی ہوتے اور حالاتِ حاضرہ پر
تبصرہ بھی (انتخاب نتیجۂ انداز دم سیتاپوری، ص: ۴-۱۳۰)

دوستی کی یہ خوشگوار فضا غالباً ۱۸۸۰ء سے پہلے تھی۔ اس لئے کہ بعد کو بیان اور
ریاض کے درمیان تیز و تند صحافتی جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس سلسلے میں رندِ پارسا
(مطبوعہ انجمن ترقیِ اردو ہند دہلی ۱۹۴۵ء) کے مصنف رئیس احمد جعفری نے
مولوی سبحان اللہ خان کا جو بیان نقل کیا ہے وہ دیکھیے:

"ریاض کی انشاپردازی کے چند دور گزرے۔ ایک جب
ریاض الاخبار سے اور اودھ پنچ لکھنؤ سے جس کے ایڈیٹر
سجاد حسین صاحب مرحوم تھے، ان سے معرکے رہے۔
دوسرا طوطیِ ہند میرٹھ سے جس کے ایڈیٹر اور لکھنے والے
بھی مشہور ادیب تھے۔ ان سے مدت تک معرکے رہے
(ص: ۳۳۶)"

بیان اور ریاض کے مابین تعلقات کی تفصیل نہ مل سکی۔ اس سلسلے میں تحقیق کی
ضرورت ہے۔

۲۴۔ میں نے یہ شرح لسان الملک کے پرچوں سے ۱۹۷۷ء میں مرتب کی تھی۔
اسے جناب مالک رام کے سہ ماہی تحریر، نئی دہلی کے شمارہ نمبر ۴۶ (اکتوبر ۱۹۷۸ء)
میں شائع بھی کروا چکا ہوں۔

کیا بیان نے غالب سے ملاقات کی تھی

"میں نے یہ کتاب نومبر ۱۹۹۱ء سے فروری ۱۹۹۲ء کے درمیان لکھی اور اس پر ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء کو جناب کالیداس گپتا رضا صاحب نے مقدمہ تحریر کیا۔ میرا ارادہ اس کتاب کو اسی سال شائع کروانے کا تھا لیکن کوششوں کے باوجود بھی اس کے انتظامات نہ ہو سکے۔

اس کے بعد میں اپنی دوسری تصانیف کی ترتیب و تالیف اور ان کی اشاعت کے معاملات میں الجھ کر رہ گیا جس کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت کا معاملہ التوا میں چلا گیا۔ خدا کا شکر کہ اس سال اس کا موقع مل رہا ہے۔

چار سال کے اس طویل عرصے میں مجھ کو چند مواد ایسے ملے جس نے مجھے اس باب کے اضافہ پر مجبور کیا۔ یہ کتاب کی کتابت کے دوران لکھا گیا ہے۔"

۱۰ جنوری ۱۹۹۷ء شرف الدین ساحل

اس اضافے کا اصل محرک جناب امان اللہ خان شیروانی کا مضمون "بیان یزدانی" ہے جو ماہنامہ آج کل نئی دہلی کے اگست ۱۹۹۲ء کے شمارے میں ص: ۳۶ پر شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ صغیر اصغر کے مضمون "غالب اور قاری جعفر علی" (مطبوعہ ماہ نامہ ماہ نو کراچی مطابق ۱۹۶۵ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بیان کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ وہ تو نطری شاعر تھے۔

وہ بہت جلد مشہور ہو گئے اور صرف ۱۴ سال کی عمر میں ہی انھوں نے اردو زبان اور اردو شاعری میں اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ ایک روز مرزا غالب کی زمین میں ایک غزل لکھی۔

غالب کا مطلع ہے:

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

بیان کی غزل کے چند اشعار یوں ہیں:

صبح قیامت آ گئی کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں کھولے ہوئے قبا کہ یوں
نرگس مہوشاں سے پوچھ، گردش آسماں سے پوچھ
سرمہ ہوئے دفا سرشت کیا کہوں اے خدا کہ یوں
ریختہ رشکِ فارسی اس سے نہ ہو سکا بیاں
محفلِ عرش میں میرے شعر مرے سنا کہ یوں

یہ غزل وہ مرزا غالب کی خدمت میں لے گئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ غالب نے غزل پڑھ کر واپس کر دی اور فرمایا "میاں میں کیا اصلاح دوں جیسا میں نے کہا ویسا ہی تم نے کہہ دیا"

بیان کئی سال دہلی میں رہے اور پھر میرٹھ واپس آ گئے اور جلوۂ طور کی ادارت سنبھالی۔ یہ سلسلہ تقریباً چھ سال چلا۔"

یہیں سے میری تحقیق کی کئی ٹوٹی ہوئی کڑیاں یکے بعد دیگرے جڑنے لگیں

اور اس سلسلے کے کئی نظر انداز گوشے اہمیت حاصل کرتے چلے گئے۔ چنانچہ مزید تحقیق کے نتیجہ میں اب میں جس حقیقت تک پہنچا ہوں یہاں اسے قلمبند کرتا ہوں۔ کیا بیان نے غالب سے ملاقات کی تھی۔ یا۔ کیا بیان نے غالب کو دیکھا تھا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے پہلے غالب سے فرقانی کے تعلقات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

فرقانی اور غالب :

سید احمد حسن فرقانی (۱۸۳۶ء - ۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء) اردو اور فارسی کے ایک جید عالم، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ ابتدا میں ان کا تخلص صارم تھا۔ بعد کو فرقانی تخلص اختیار کیا۔ ان کا اردو میں شاکی اور باکی تخلص تھا جبکہ وہ فارسی میں فرقانی تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کی تصانیف میں دیوانِ فرقانی (فارسی شاعری کا دیوان)، دیوان شاکی (اردو غزلیات کا دیوان)، سخن باکی (اردو کے مدحیہ اور رثائی کلام کا مختصر مجموعہ)، انشائے فرقانی (فارسی خطوط، رقعے اور عرضداشتوں کا مجموعہ) قابل ذکر ہیں۔

فرقانی کے والد سید ابواحمد علی عرف سید کفایت علی تنہا دراشد (۱۸۱۵ء - یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء) ملازمت پیشہ تھے۔ وہ پہلے محکمہ انسداد ٹھگی وڈکیتی کے محافظِ دفتر و میر منشی رہے۔ بعد میں پنجاب میں ضلع کے سررشتہ دار اور پھر دلی اور پنجاب میں میر منشی و سپرنٹنڈنٹ کمشنری رہے۔ انھوں نے ۱۸۶۸ء میں پنشن پائی۔

جناب علی جواد زیدی نے فرقانی میرٹھی اور ان کے خاندانی حالات پر "غالب کا ایک ہم عصر سید احمد حسن فرقانی و شاکی" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے۔ یہ ان کی کتاب فکر و ریاض (مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، نومبر

۱۹۷۵ ، ص : ۱۶۲ تا ۲۱۶) میں شامل ہے ۔ ویسے یہ مضمون ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۵ء میں بھی چھپ چکا ہے ۔ جناب علی جواد زیدی کی تحقیق کے مطابق :

" زقانی کے والد منشی کفایت علی تنہا ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۸ء تک کمشنر دہلی کے میر منشی رہے ۔ اس زمانے میں زقانی کا قیام بھی دلی میں ہی رہا " (ذکر ریاض ، ص : ۱۸۸)

یہیں سے زقانی اور غالب میں ادبی روابط قائم ہوئے جو بعد کو گہرے مراسم میں بدل گئے یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے ۔ دونوں ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھی بھیجنے لگے ۔ جناب علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

" غالب جو اس دور کی دلی میں فارسی ادب کے سب سے اہم نمائندے تھے ، ان سے زقانی کیسے دور رہ سکتے تھے ۔ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۸ء کے مابین تو یقینی طور سے اور غالباً اس کے پہلے بھی غالب اور زقانی میں روابط ادبی قائم ہو گئے تھے " (ذکر ریاض ، ص : ۱۸۹)

اس کے بعد انھوں نے اس زمانے میں سارے زمانے سے غالب کی بیزاری کا ذکر کیا ہے اور ثبوت میں ان کے خطوط سے اہم اقتباسات نقل کئے ہیں ۔ پھر زقانی و غالب کے تعلقات پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے :

دلّی کی عام تباہی ، الی پریشانی اور بیزاری کے عالم میں زقانی کا خلوص ، ان کا ادبی ذوق اور علما و ادبا کے لیے ان کا عام جذبۂ خدمت انھیں غالب کے قریب لایا اور تفاوتِ سن کے باوجود حالات نے اس قربت میں ایک کیفیتِ خاص پیدا کر دی ۔ اس لئے زقانی جو ہمیشہ جویائے کمال

فوقانی کے خاندان کا شجرہ :

سید کمال ابن سید شاہین

سید جلال عرف سید رفیع الدین

سید میر

سید الٰہی بخش عرف میر میندھو

- سید عمر دراز علی (وفات: ۱۸۶۰ء)
  - سید گوہر علی ابن سید کرامت علی (زوجہ) (ف: ۱۸۹۳)
    - اصغر حسین، محمد مرتضیٰ بیان (۱۸۵۰–۱۹۰۰) (لاولد)، یعسوب الدین، سلطان الحق (ف: ۱۹۰۷ء)، ابو الحسن، محمد، حسین شرف، آغا علی
      - سید ضیاء الاسلام عیاں (۱۹۰۷ء – ۱۹۳۵ء)
  - سید مہدی علی (وفات: ۱۹۰۵ء)
- سید کفایت علی تنہا درانشد (۱۸۱۵ء – ۱۸۶۹ء)
  - سید احمد حسن فوقانی، شاکی (پیدائش ۱۸۳۶، وفات ۱۸۸۳ء)
    - سجاد حسین ریحان (۱۸۵۱ء – ۱۸۸۳ء)
    - کرار حسین روحانی (۱۸۶۴ء –)
      - سید حیدر حسین رضوی (ہمزلف علی جواد زیدی)
- سید ولایت علی (وفات: ۱۸۸۴ء میرٹھ) (لاولد)

رہتے تھے خود غالب کے پاس پہنچے ہوں گے اور اس کے
بعد ہی آپس میں لین دین کا سلسلہ جاری ہوا ہوگا۔ جہاں
اس کا امکان قوی ہے کہ فرقانی یا ان کے والد نے ہاں کوئی
خدمت کی ہو، وہاں اس کا ثبوت موجود ہے کہ غالب نے
بھی جواب میں تحفے بھیجے ہوں گے۔ یہ ان کی شان کے
مناسب بات تھی۔ (فکر و ریاض، ص: ۱۹۰)

اتنا لکھنے کے بعد جناب زیدی مقدمہ کلیات فرقانی کے ص: ۴۸ سے فرقانی کے بیٹے سید کرار حسین روحانی کے بیان کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں:

"اکثر باہم تحف و ہدایا کی رسم جاری تھی۔ ازاں جملہ ایک
طلائی کام کی منہال جس پر "یا اسداللہ غالب" منقوش
ہے ہنوز راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔"

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد وہ کچھ آگے یہ لکھتے ہیں:

"خلوص اور ذوق شعری نے دونوں کو ایک دوسرے کے
بہت قریب کر دیا تھا۔ فرقانی تو غالب کے یہاں جایا ہی کرتے
تھے، خود غالب بھی برابر فرقانی کے مکان پر آتے تھے۔۔۔"
"جب فرقانی غالب کے یہاں حاضر ہوتے تو بعض اوقات
ان کے چچا زاد بھائی سید مہدی علی بھی ہوتے تھے۔۔۔۔"
(فکر و ریاض، ص: ۱۹۱)

اس کے بعد انھوں نے مقدمہ کلیاتِ فرقانی کے حوالے سے سید مہدی علی اور روحانی کے بیان کی روشنی میں فرقانی اور غالب کے مابین گہرے تعلقات سے متعلق چند واقعات پیش کیے ہیں اور آخیر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ ذوقانی غالب کے آخری اہم دوست ہیں جن سے غالب کے آخری عمر میں اتنے گہرے مراسم پیدا ہوگئے تھے۔ ذوقانی کا قیام ۱۸۶۸ء تک دلی ہی میں رہا۔ پھر ان کے والد پنشن لے کر گھر آگئے اور ذوقانی بھی دلی سے چلے آئے۔ فروری ۱۸۶۹ء میں غالب کا انتقال اور اس آخری دوستی کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان زیادہ دنوں تک خط وکتابت کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اگر رہتا تو ہمیں غالب کے چند اچھے علمی و ادبی خطوط اور دیکھنے کو مل جاتے۔ پھر بھی مجھے ذوقانی کے پوتے سید حیدر حسین رضوی سے معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں غالب کے کچھ خطوط موجود تھے، جن کا علم کسی طرح یوپی پبلک سروس کمیشن کے سابق چیرمین سید ابو محمد کو ہوگیا اور انھوں نے یہ خطوط حاصل کر لیے۔ واپسی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا اور اب ان خطوط کا پتہ نہیں چلتا"

(فکر و ریاض، ص: ۱۹۲، ۱۹۳)

ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے نام مولوی مہیش پرشاد کے ایک خط سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ غالب اور ذوقانی کے بیچ خط وکتابت ہوتی تھی۔ مولوی مہیش پرشاد، ڈاکٹر مختار الدین کو ۲۶ فروری ۱۹۴۹ء کو لکھتے ہیں:

"مرزا غالب کے دو خطوط ذوقانی نام کے ایک شاعر صاحب کے نام ہیں۔ مجھے صرف یہی معلوم ہو سکا ہے کہ ذوقانی صاحب میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ماجد صاحب کمشنر دہلی کے یہاں میر منشی تھے (ماہنامہ نقوش لاہور،

مکاتیب نمبر، جلد دوم، ص: ۶۴۵)
زرقانی اور غالب کے مابین تعلقات پر فرخ جلالی نے بھی اپنے مضمون "کچھ غالب کے بارے میں" میں روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بھی وہی، ماخذ مراجع ہیں جو جناب علی جواد زیدی کے مضمون میں ہیں۔ فرخ جلالی کا مضمون ماہنامہ آج کل دہلی کے فروری ۱۹۵۹ء کے شمارے میں ص: ۳۷ پر شائع ہوا ہے۔

تفصیل کار:

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ زرقانی اور ان کے خاندان سے غالب کے ۱۸۶۲ء سے ان کی وفات تک گہرے مراسم رہے۔ زرقانی کے والد سید کفایت علی تنہا اور زرقانی کے چچا زاد بھائی سید مہدی علی ابن سید عمر دراز علی کو بھی غالب سے عقیدت و محبت تھی۔ اس کا ثبوت جناب زیدی کے مضمون میں موجود ہے۔
یہ تمام افراد بیان میرٹھی کے ننہالی رشتہ دار تھے۔ (شجرہ ملاحظہ کیجیے) اور انھوں نے بیان کی تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا تھا۔
جیسا کہ شجرہ سے ظاہر ہے سید کفایت علی تنہا، بیان کے حقیقی نانا سید عمر دراز علی کے حقیقی بھائی تھے اور زرقانی، سید کفایت علی تنہا کے اکلوتے بیٹے۔
پھر جناب علی جواد زیدی کی تحقیق کے مطابق:

> "تین حقیقی بھائی کے درمیان ایک اولادِ نرینہ تھی اور وہ زرقانی تھے۔ اس لئے جب تک سید عمر دراز علی کے لڑکے سید مہدی علی پیدا نہیں ہوئے تھے زرقانی سبھی کی محبت و توجہ کا مرکز بنے رہے۔ بالخصوص ابتدائی پرورش و تعلیم و تہذیب عمر دراز علی ہی نے اپنی نگرانی میں کرائی۔ شاید

یہ اس زمانے کی بات ہوگی جب زرقانی کے والد اور چچا
دونوں ہی ملازمت کے سلسلے میں آگرہ میں (غالباً ۱۸۴۰ء
اور ۱۸۵۰ء کے مابین) مقیم تھے (تذکرۂ دریاض، ص: ۱۶۷)

جس طرح زرقانی اپنے والد کے اکلوتے اور اپنے چچا سید عمر دراز علی کے چہیتے تھے اسی طرح بیان کی والدہ یعنی عمر دراز علی کی بیٹی بھی اس وقت اکلوتی تھی اور خاندان کی چہیتی تھی۔ وہ غالباً عمر میں زرقانی سے بڑی تھیں۔ سید مہدی علی عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ان تینوں بہن بھائیوں میں آپس میں حد درجہ انسیت تھی۔ یہ انسیت ہمیشہ قائم رہی۔

بیان کا ننہال دہلی میں:

بیان کے حقیقی نانا سید عمر دراز علی اور زرقانی کے والد سید کفایت علی غالباً ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء کے مابین بسلسلۂ ملازمت آگرہ میں ایک ساتھ مقیم رہے۔ اس کے بعد سید کفایت علی فیروزپور (پنجاب) تبدیل ہو کر چلے گئے (تذکرۂ دریاض، ص: ۱۶۷)
انھی ایام میں غالباً سید عمر دراز علی کا بھی تبادلہ ہوا۔ اس لئے کہ بیان میرٹھی کی ولادت کے سلسلے میں اکثر جگہ یہ بات ملتی ہے کہ ان کی پیدائش جھانسی میں ان کے نانا کے مکان میں ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی جہاں وہ اس وقت ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ سید عمر دراز علی نے کچھ عرصہ کالپی میں بھی گزارا۔ ان کا ۱۸۶۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا خاندان میرٹھ آگیا جو حقیقی وطن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید عمر دراز علی کی وفات کے بعد سید کفایت علی نے ان کے اہل و عیال کو ۱۸۶۲ء میں جب وہ پنجاب سے منتقل ہو کر دہلی آئے تو اپنے پاس بلوالیا تھا اور وہ انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ جناب علی جواد زیدی کے مضمون میں جگہ جگہ سید مہدی علی ابن سید عمر دراز علی کی دہلی میں

ان کے ساتھ ساتھ رہنے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ یہ ساتھ اس وقت چھوٹا جب ۱۸۷۰ء کے بعد سید مہدی علی کو سرکاری نوکری ملی۔ اس سلسلے میں وہ مختلف مقامات پر رہے۔ انھوں نے ڈپٹی کلکٹر کے مرتبے کو پہنچ کر ۱۹۰۵ء میں گورکھپور میں رحلت فرمائی۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۸ء تک بیان کا ننھیال دہلی میں تھا۔

بیانؔ دہلی میں:

بیان کی پیدائش جھانسی میں ہوئی تھی اور ان کا بچپن ان کے نانا کے ساتھ جھانسی و کالپی میں گزرا تھا۔ وہ بھی اپنے نانا کے انتقال کے بعد خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ میرٹھ آئے جیساکہ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بیان میرٹھی کے نعتیہ مجموعۂ کلام قندیلِ حرم (مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۴ء) کے دیباچہ میں لکھاہے:

> "بیان ۱۸۶۰ء تک جبکہ ان کے نانا کا انتقال ہوا جھانسی اور کالپی وغیرہ میں مقیم رہے اور تقریباً دس سال کی عمر میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ میرٹھ آ کر سکونت پذیر ہو گئے" (قندیلِ حرم، ص: ۵)

میرا خیال ہے کہ جب سید کفایت علی نے اپنے بھائی سید عمر دراز علی کے اہل و عیال کو دہلی بلوایا تو ان کے ساتھ بیان بھی دہلی آئے اس لئے کہ وہ انھی کے ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ان کی مزید تعلیم و تربیت دہلی میں نانا اور ماموں کی نگرانی میں ہوئی۔ یہ بات میں اس لئے بھی لکھ رہا ہوں کہ ہر تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہے کہ "بیان نے عربی و فارسی کی کتابیں میرٹھ کے ایک شیعی عالم مرزا باقر علی

بیگ سے پڑھی تھیں "

یہ وہ بزرگ ہیں جن سے فرقانی کے گہرے مراسم تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن بعد کو انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ جناب علی جواد زیدی، فرقانی کے دہلی کے احباب کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

" دلی میں کوئی مولوی مرزا باقر علی بیگ بھی تھے۔ ان سے بھی (فرقانی کے) مراسم تھے۔ غالباً انھوں نے بعد میں میرٹھ میں ہی قیام اختیار کرلیا تھا " (تذکرۂ ریاض، ص: ۱۹۷)

تذکرہ نگار اس بات پر بھی متفق ہیں کہ بیان کے ذوق شعری کو فرقانی میرٹھی نے تقویت پہنچائی تھی۔ کسی نے تو ان کو فرقانی میرٹھی کا شاگرد تک لکھ دیا ہے۔ کسی نے اس کی تردید کی ہے۔ بہر حال ہے یہ حقیقت کہ ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں فرقانی کا زبردست حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیان ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ ان سے انھیں دلی عقیدت و محبت تھی۔ اس کا ثبوت وہ مرثیہ ہے جو بیان نے ان کی وفات سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ اس مرثیہ کے ہر بند کی تان یوں ٹوٹتی ہے:

فرقتِ فرقانی وشا کی دریغ
رحلتِ فرقانی وشا کی دریغ

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ بیان بھی ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۸ء تک دہلی میں اپنے نانا اور ماموں کے ساتھ سکونت پذیر رہے۔ وہیں ان کی مزید تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہیں فرقانی سے ان کا براہِ راست رابطہ قائم ہوا۔ ان کی ادبی مجلسوں کو دیکھنے یا ان میں شریک ہونے کا موقع ملا جن کی وجہ سے ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا۔ انھوں نے انھی ایام

میں یقیناً غالب کا دیدار بھی کیا اور غالب کی خدمت میں کسی موقع پر وہ غزل بھی پیش کی جس کا ذکر ابتدا میں آیا ہے ۔

کتابیات

انتخاب فتنہ از نادم سیتاپوری
بیان میرٹھی (حیات و شاعری) از ڈاکٹر شرف الدین ساحل مطبوعہ فاطمی آرٹ پرنٹرس ناگپور ۱۹۸۰ء۔
تاریخ صحافت اردو (حصہ سوم) از امداد صابری مطبوعہ جدید پرنٹنگ پریس دہلی۔
خم خانۂ جاوید (حصہ اول) از لالہ سری رام
دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام مطبوعہ غالب اکیڈمی نئی دہلی۔
رنگِ شہادت مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
رند پارسا از رئیس احمد جعفری مطبوعہ انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی ۱۹۴۵ء۔
فکر دریاض از علی جواد زیدی مطبوعہ مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
قندیلِ حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۴ء۔
ہندوستانی پریس از نادر علی خان مطبوعہ اتر پردیش اردو اکاڈمی لاہور ۱۹۹۰ء۔
یادگار غالب از الطاف حسین حالی مطبوعہ چمن بکڈپو دہلی۔

جرائد و رسائل :

العصر	ماہنامہ لکھنو	اگست ستمبر ۱۹۱۳ء
امروز	روزنامہ کراچی	۴ ستمبر ۱۹۵۰ء
آج کل	ماہنامہ دہلی	فروری ۱۹۵۹ء
آج کل	ماہنامہ دہلی	ستمبر ۱۹۷۰ء
آج کل	ماہنامہ دہلی	اگست ۱۹۹۲ء
تحریر	سہ ماہی دہلی	اپریل ۱۹۷۵ء (شمارہ ۳۲)
تحریر	سہ ماہی دہلی	اکتوبر ۱۹۷۸ء (شمارہ ۴۶)
تحریک	ماہنامہ دہلی	جولائی ۱۹۷۷ء
جلوۂ یار	ماہنامہ میرٹھ	اپریل ۱۹۲۱ء
شاعر	ماہنامہ بمبئی	غالب نمبر
لسان الملک	ماہنامہ میرٹھ	مختلف پرچے
نیا دور	ماہنامہ لکھنو	جنوری ۱۹۶۵ء
نیا دور	ماہنامہ لکھنو	مارچ اپریل ۱۹۷۱ء
نیا دور	ماہنامہ لکھنو	غالب نمبر
نقوش	ماہنامہ لاہور	مکاتیب نمبر، جلد دوم

ڈاکٹر شرف الدین ساحل اردو کے ایک بزرگ صورت اور جوان ہمت محقق اور شاعر ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں ہیں جو ان کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی دیانت کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بیان میرٹھی: حیات و شاعری ان کا ایک بے مثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ بیان میرٹھی کو اردو دنیا میں ان کا صحیح مقام دلانے کے لئے ان کی ادبی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ضروری ہے۔ اب ان کی ایک اور کتاب "بیان میرٹھی اور غالب" شائع ہو رہی ہے۔ جس میں انھوں نے بیان میرٹھی کے فکر و فن پر غالب کے اثرات کی چھان بین کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کی عمروں میں تفاوت کے باوجود بیان میرٹھی نے نہ صرف یہ کہ غالب کی زمینوں میں شاعری کی ہے بلکہ انھوں نے غالب کے خطوط کے اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ یہ اثرات زبان کے استعمال، طریقہ کار، رویے اور خطوط نگاری کے ہر پہلو پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیان میرٹھی کے خطوط کا مجموعہ غالب کے "عودِ ہندی" کے زیرِ اثر "تیغ ہندی" کے نام سے موجود ہے جو مخطوطے کی شکل میں ڈاکٹر ساحل کے پاس ہے۔ بیان میرٹھی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں غالب کی ۱۳ غزلوں کی شرح بھی لکھی ہے جو لسان الملک میرٹھ میں شائع ہو چکی ہے۔

اردو میں اس تحقیقی کام کا سہرا ڈاکٹر شرف الدین ساحل کے سر ہے۔ میں موصوف کی اس کتاب کا تہہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ اردو دنیا بھی اس کارِ خیر میں میرے ہمراہ رہے گی۔

(پروفیسر) عنوان چشتی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی